Date of Publication : 23-10-2014

PRICE Rs. 2/-

POSTED AT N.D.P.S.O, New Delhi-01
ON 24-25 Oct. 2014 R.N.I No. 2166/57

POSTAL REGN. NO. DL (C) -01/1195/2012-14
Licensed to Post Without Prepayment U (C) 160/2012-14

HAMARI ZABAN (WEEKLY)

ہفت روزہ

ہماری زبان

انجمن ترقی اردو (ہند) نئی دہلی

1-7 November 2014
Issue: 41, Vol.: 73

یکم تا ۷ نومبر ۲۰۱۴ء
شمارہ نمبر: ۴۱، جلد نمبر: ۷۳

یوم اردو کے تعین کا مسئلہ

اطہر فاروقی

یوم اردو منانے کی بات زور شور کے ساتھ 2007 کے آس پاس اٹھی تھی۔ اس وقت ایک اردو اخبار کے نمائندے نے اس سوال کو کچھ اس طرح اٹھایا کہ اپنے ایک رشتے دار سے جو دہلی یونیورسٹی کے شعبۂ اردو میں استاد ہیں، معلوم کرکے کہ اردو ڈے کب منایا جائے، ایک بڑی اسٹوری شائع کی۔ مذکورہ استاد علم و سیاست دونوں کے معاملات سے بالکل بے خبر مگر اپنے معاملات میں غیر معمولی طور پر چوکس اور ذہین کے زمرے میں شمار کیے جاتے ہیں۔ یوں انھوں نے ذہن پر زور ڈالے بغیر اقبال کے یوم پیدائش 9 نومبر — جو جو 9 نومبر 1877 ہے، بہت تحقیق کے بعد شاعر مشرق کی تاریخ ولادت کے طور پر متعین کی گئی اور اب وہی مستند بھی جاتی ہے — کو یوم اردو کے طور پر منانے کا مشورہ دیا، جس کے بعد بہت سی تنظیموں پر 9 نومبر کو اقبال ڈے منایا جانے لگا۔ اس سے پہلے بھی کچھ تنظیموں پر یوم اردو 9 نومبر کو منایا جاتا تھا، مگر بہت چھوٹے پیمانے پر۔ ملک کے کئی حصوں، خصوصاً بہار میں بہت زمانے سے مولانا آزاد کے یوم پیدائش 11 نومبر 1888 کے موقعے پر خاصی بڑی تعداد میں یوم اردو منایا جاتا ہے۔

یہ وقت اقبال کی عظمت کی تائید میں دلائل دینے کا نہیں ہے۔ جو اپنے متنازعہ سیاسی خیالات کے باوجود بلاشبہ اردو کے عظیم ترین شاعروں میں سے ایک ہیں۔ وہ اسلامی تاریخ کے مجتہدین کی کہکشاں کا حصہ ہیں اور قدیم اسلامی فلسفیوں پر گہری نظروں میں سبقت رکھتے ہیں۔ انھیں مغربی علوم پر قدرت حاصل تھی، اس لیے، اگر یہ کہا جائے کہ اقبال اسلامی تاریخ میں منفرد و ممتاز حیثیت کے حامل ہیں، تو اس میں کسی مبالغے کا دخل نہ ہوگا۔ تاہم اقبال کے یوم ولادت کی مناسبت سے یوم اقبال کی تقریب سعید تو مناسب ہے مگر یوم اردو کے تعین کے لیے ہمیں کسی اور نام پر ہی غور کرنا ہوگا۔

دو برس پہلے جواہر لعل نہرو یونیورسٹی کے ایک استاد نے پنڈت دیونرائن پانڈے اور بے بہادر سنگھ کے یوم شہادت کو یوم اردو کے طور پر منانے کی تجویز کو مشن بنالیا۔ پنڈت دیونرائن پانڈے اور بے بہادر سنگھ ایسے عاشقانِ اردو کی خدمات کو اردو معاشرے کے ارسے فراموش کرنا اردو والوں آبادی کی بد ترین بےحسی کا علامیہ ہے۔ ان دونوں مجاہدین نے اردو کا تحفظ دینے کے رضاکاروں کے طور پر اتر پردیش میں اردو کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ دینے کا مطالبہ کرتے ہوئے غیر معینہ مدت کے لیے بھوک ہڑتال کی تھی۔ دیو نرائن پانڈے نے ۲۰ مارچ 1967 کو کانپور کے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کے دفتر کے باہر اور بے بہادر سنگھ نے لکھنؤ میں اسمبلی کے باہر یہ بھوک ہڑتال شروع کی تھی۔ پانڈے جی کی موت 31 مارچ 1967 کو ہوئی اور بے بہادر سنگھ نے اس کے چند روز بعد داعی اجل کو لبیک کہا۔ بات بہت زیادہ پرانی نہیں، مگر اردو والے ان بے مثال عاشقانِ اردو کو یکسر فراموش کرچکے ہیں۔ ان تمام عظیم قربانیوں کے باوجود بھی اردو جیسی ملک گیر سطح پر بولی جانے والی زبان سے وابستہ سب سے اہم دن کو دیونرائن پانڈے اور بے بہادر سنگھ سے موسوم نہیں کیا جاسکتا۔ اردو جیسی بڑی زبان جس کا ادب تیسری دنیا کے ادب میں وسیع ترین ہے، کے یوم تفاخر کو واقعتا جس شخصیت سے موسوم کرنے کی ضرورت ہے وہ آزاد ہندوستان میں — میری ناقص رائے میں — مولانا ابوالکلام آزاد کے سوا دوسرا نہیں ہوسکتا۔ اردو کو مولانا سے وابستہ کرنا سیاسی طور سے بھی ٹھیک ہوگا جو جمہوریت میں سب سے زیادہ ضروری ہے۔ اپنی تمام تر سیاسی سرگرمیوں کے باوجود ایک اہل قلم کے طور پر مولانا کی حیثیت منفرد ہے۔ سیاسی سطح پر بھی اردو کے تئیں مولانا کی خدمات ناقابل فراموش ہیں بلکہ یہ کہنے میں قطعی مبالغہ نہیں کہ آج اگر ہندوستان میں اردو زندہ ہے تو اس کا سہرا مولانا کے علاوہ کسی اور کے سر نہیں باندھا جاسکتا۔ یہ سچ ہے کہ پنڈت جواہر لعل نہرو کی بے پناہ مدد کے بغیر مولانا اردو کے لیے کچھ نہیں کرسکتے تھے، مگر یہ سوال اپنی جگہ ہے کہ اگر مولانا نہ ہوتے تو تقسیم کے بعد حالات میں — اب جن کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا — مسلمانوں کی کیسی درگت بنتی۔

مولانا آزاد ہندوستان کے آج بھی سب سے بڑے وزیر تعلیم تصور کیے جاتے ہیں۔ انڈین کاؤنسل فار کلچرل ریلیشنز (ICCR) جو وزارت خارجہ کی ثقافت کے ذریعے ڈپلومیسی کا سب سے موثر ادارہ ہے، کے قیام کا تصور مولانا جیسے نابغۂ روزگار ہی کے ذہن میں آسکتا تھا۔ آئی آئی ٹیز (IITs)، یونیورسٹی گرانٹس کمیشن، ساہتیہ اکادمی، سنگیت ناٹک اکادمی، للت کلا اکادمی (National Academy for Fine Arts) کے قیام کا تصور مولانا آزاد کے سوا ہندوستان کے کس وزیر تعلیم کے ذہن میں آسکتا تھا؟ مولانا کے بعد کوئی ایک ایسا وزیر تعلیم ہندوستان میں نہ ہوا جس نے کسی ایک بھی تعلیمی اور ثقافتی پالیسی ساز ادارے کے قیام کا ڈول ڈالا ہو۔ یہ بات کم لوگوں کو معلوم ہوگی کہ ڈاکٹر ذاکر حسین نے انجمن ترقی اردو (ہند) کے پلیٹ فارم سے 20 لاکھ 50 ہزار دستخطوں کے ساتھ جو محضر صدر جمہوریہ کو پیش کیا تھا، وہ نہرو نے وزارت داخلہ جو زبانوں کے معاملات کی وزارت بھی ہے، کے بجائے مولانا آزاد کے پاس ہی بھیجا تھا۔ اس دور میں ظاہر ہے کہ اردو کے لیے کھلے طور پر کچھ بھی کرنے کے حالات نہ تھے۔ حالات اس قدر دگرگوں تھے کہ پنڈت نہرو اردو کے معاملات میں شمالی ہند کے وزرائے اعلا کے سامنے خود کو مکمل طور پر بے بس پاتے تھے، اس لیے نہرو اور مولانا نے اردو کے لیے جو کچھ بھی کیا وہ نہایت ہی خاموشی اور انتہائی سیاسی تدبر کے ساتھ کیا۔ یہی وجہ ہے کہ آج اردو اس ملک میں بہت سے نشیب و فراز سے گزر کر ایک زندہ زبان کے طور پر ترقی کررہی ہے، اعلا تہذیب و ثقافت کی زبان سمجھی جاتی ہے۔ کل اردو کی ترقی کا سفر کس سمت میں ہوگا، اس کا فیصلہ مستقبل کے سیاسی محرکات کے تابع ہے مگر یوم اردو کی مولانا آزاد سے نسبت قائم کرنا ہر اعتبار سے احسن و مستحسن ہے۔ جمہوریت میں ہر فیصلہ خوب سوچ سمجھ کر کیا جانا چاہیے، اس لیے، میرے خیالات کو محض ایک تجویز سے زیادہ کچھ نہ سمجھا جائے مگر اس موضوع پر بحث و تمحیص کا سلسلہ شروع ہونا چاہیے کہ جلد ہی اردو والے کسی نتیجے پر پہنچ سکیں۔

•••

...اردو اس ملک میں بہت سے نشیب و فراز سے گزر کر ایک زندہ زبان کے طور پر ترقی کررہی ہے، اعلا تہذیب و ثقافت کی زبان سمجھی جاتی ہے۔ کل اردو کی ترقی کا سفر کس سمت میں ہوگا، اس کا فیصلہ مستقبل کے سیاسی محرکات کے تابع ہے مگر یوم اردو کی مولانا آزاد سے نسبت قائم کرنا ہر اعتبار سے احسن و مستحسن ہے۔ جمہوریت میں ہر فیصلہ خوب سوچ سمجھ کر کیا جانا چاہیے، اس لیے، میرے خیالات کو محض ایک تجویز سے زیادہ کچھ نہ سمجھا جائے مگر اس موضوع پر بحث و تمحیص کا سلسلہ شروع ہونا چاہیے کہ جلد ہی اردو والے کسی نتیجے پر پہنچ سکیں۔

دوسری اور آخری قسط

ہماری فلمیں اور مرزا غالبؔ

رشید انجم
47-کاشانہ، اسلام پورہ
بھوپال 462001، ایم پی

(گزشتہ سے پیوستہ)

۱۹۳۹ء فلم 'غازی صلاح الدین' سپریم پکچرز بمبئی، ہدایت: آئی اے حافظ جی، موسیقی: کھیم چند پرکاش، گیت کار: حکیم احمد شجاع، اداکار: رتن بائی، غلام محمد، مظہر خان، الکا دیوی، محمد اسحاق، ایشور لال، ڈبلیو ایم خان، مرزا مشرف۔

(۱)

کبھی نیکی بھی اس کے جی میں گر آجائے ہے مجھ سے
جفائیں کر کے اپنی یاد شرما جائے ہے مجھ سے

آواز: کلیانی

۱۹۴۰ء فلم 'قیدی' فلم کارپوریشن آف انڈیا کلکتہ، ہدایت: ایس ایم حسنین، موسیقی: بھیشم چٹرجی، گیت کار: آرزو لکھنوی، اداکار: رسولا، مہتاب، مانو رنگر، موتیکا ڈیسائی، واسطی، ہیر پرساد، لیلا مشرا، مادھوری

(۱)

رہیے اب ایسی جگہ چل کر جہاں کوئی نہ ہو
اپنا پرایا مہرباں اور نامہرباں کوئی نہ ہو

آواز: مہتاب

۱۹۴۱ء فلم 'معصوم' فضلی برادرس بمبئی، ہدایت: ایس ایم حسنین، موسیقی: منشی مبارک حسین، گیت کار: آرزو لکھنوی، اداکار: امجد، رسولا، مظہر خان، مہتاب، انیس، خواجہ صابر، جل، نذیر کشمیری۔

(۱)

آہ کو چاہیے اک عمر اثر ہونے تک
کون جیتا ہے تری زلف کے سر ہونے تک

آواز: رسولا

۱۹۴۲ء فلم 'لالہ جی' نیشنل اسٹوڈیوز بمبئی، ہدایت: للت چندر مہتا اور چمن کانت گاندھی، موسیقی: وسنت کمار، گیت کار: نیل کنٹھ تواری اور آرزو لکھنوی۔

(۱)

ہم سے کھل جاؤ بوقتِ مے پرستی ایک دن
ورنہ ہم چھیڑیں گے رکھ کر عذرِ مستی ایک دن

آواز: وتسلا کمٹھیکر اور امر

۱۹۴۲ء فلم 'چوڑیاں' فضلی برادرس بمبئی، ہدایت: ایس فضلی، موسیقی: قاضی نذرالاسلام اور ہنومان پرساد شرما، گیت کار: آرزو لکھنوی، نذرالاسلام اور جگر مرادآبادی، اداکار: انیس خاتون، مہتاب، امجد، نذیر کشمیری، ہیر پرساد۔

(۱)

کوئی امید بر نہیں آتی
کوئی صورت نظر نہیں آتی

آواز: انیس خاتون

نوٹ: اس فلم میں 13 گانے تھے، جن میں 10 گانے آرزو لکھنوی اور نذرالاسلام نے لکھے تھے۔ مرزا غالبؔ کی مذکورہ غزل کے علاوہ جگر مرادآبادی کی دو غزلیں 'یہ کس کا تصور ہے یہ کس کا فسانہ ہے' اور 'وہ کب کے آئے بھی اور گئے بھی' شامل کی گئی تھیں۔

۱۹۴۳ء فلم 'ہنٹر والی کی بیٹی' بسنت پکچرز بمبئی، ہدایت: بٹوک بھٹ، موسیقی: چھنا لال نایک، گیت کار: اے کریم، اداکار: ناڈیا، جان کاؤس، سردار منصور، راج کماری، سیانی، گلاب، رانی بالا، خان مستانہ۔

(۱)

دلِ ناداں تجھے ہوا کیا ہے
آخر اس درد کی دوا کیا ہے

آواز: خان مستانہ

۱۹۴۷ء فلم 'سرائے کے باہر' نیشنل اسٹوڈیوز بمبئی، ہدایت: کرشن چندر، موسیقی: ڈی سی دت، گیت کار: وشوامتر عادل اور نیاز حیدر، اداکار: سونتا دیوی، ہیماوتی، حسن، طالش، قادر، مہیندر ناتھ، شوراج، راج مہرہ، ٹنکو۔

(۱)

پھر مجھے دیدۂ تر یاد آیا
دل جگر تشنۂ فریاد آیا

آواز: نامعلوم

نوٹ: یہ فلم کرشن چندر کے ڈرامے 'سرائے کے باہر' پر اسی نام سے کرشن چندر نے اپنی ہدایت میں بنائی تھی۔

۱۹۴۹ء فلم 'اپنا دیش' راج کمل کلا مندر بمبئی، ہدایت: وی شانتا رام، موسیقی: پرشوتم، گیت کار: دیوان شرر، اداکار: پشپا ہنس، رومیش شرما، منموہن کرشن، سدھا آپٹے، دیوان شرر، چندر شیکھر۔

(۱)

دلِ ناداں تجھے ہوا کیا ہے
آخر اس درد کی دوا کیا ہے

(۲)

کوئی امید بر نہیں آتی
کوئی صورت نظر نہیں آتی

آواز: پشپا ہنس

۱۹۵۰ء فلم 'کشمیر ہمارا ہے' روپ کا ٹیکنیکن بمبئی، ہدایت: کے۔ کے۔ ورما، موسیقی: جگن میں لاہری، گیت کار: کے۔ کے۔ ورما، احسان میرٹھی، رام چندر آشو، اداکار: میرا مشرا، پریش بنرجی، سندر، ہیرا لال، پہاڑی سانیال، کمل مشرا، پی کمار، نوازش علی۔

(۱)

دلِ ناداں تجھے ہوا کیا ہے
آخر اس درد کی دوا کیا ہے

آواز: نامعلوم

۱۹۵۱ء فلم 'گھائل' شری نورتن چترا بمبئی، ہدایت: رام چندر ٹھاکر، موسیقی: گیان دت، گیت کار: سرستی کمار دیپک، منوہر کھنہ، ایم جی ادیب، پی ایل سنتوشی، شیخ آدم، پنڈت اندر۔

(۱)

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے
بہت نکلے مرے ارمان لیکن پھر بھی کم نکلے

آواز: غلام مصطفیٰ درانی

۱۹۵۴ء فلم 'مرزا غالب' منروا مووی ٹون بمبئی، ہدایت: سہراب مودی، موسیقی: غلام محمد، نغمہ نگار: مرزا غالب اور شکیل بدایونی، اداکار: ثریا، بھارت بھوشن، نگار سلطانہ، الیاس، درگا کھوٹے، افتخار، سعادت علی، کم کم، روشن، مقری، مراد، بیج شرما، جیلانی، غلام محی الدین، جگدیش سیٹھی۔

(۱)

نکتہ چیں ہے غمِ دل اس کو سنائے نہ بنے
کیا بنے بات جہاں بات بنائے نہ بنے

آواز: ثریا

(۲)

ہے بسکہ ہر اک ان کے اشارے میں نشاں اور
کرتے ہیں محبت تو گزرتا ہے گماں اور

آواز: محمد رفیع

(۳)

پھر مجھے دیدۂ تر یاد آیا
دل جگر تشنۂ فریاد آیا

آواز: طلعت محمود

(۴)

عشق مجھ کو نہیں وحشت ہی سہی
میری وحشت تیری شہرت ہی سہی

آواز: طلعت محمود

(۵)

دلِ ناداں تجھے ہوا کیا ہے
آخر اس درد کی دوا کیا ہے

آواز: طلعت محمود اور ثریا

(۶)

آہ کو چاہیے اک عمر اثر ہونے تک
کون جیتا ہے تری زلف کے سر ہونے تک

آواز: ثریا

(۷)

رہیے اب ایسی جگہ چل کر جہاں کوئی نہ ہو
اپنا پرایا مہرباں اور نامہرباں کوئی نہ ہو

آواز: ثریا

(۸)

یہ نہ تھی ہماری قسمت کہ وصالِ یار ہوتا
اگر اور جیتے رہتے یہی انتظار ہوتا

آواز: ثریا

نوٹ: سعادت حسن منٹو نے اس فلم کا اسکرپٹ لکھا تھا مگر اچانک ان کی رحلت کے بعد اس کا اسکرپٹ اور مکالمے راجندر سنگھ بیدی نے مکمل کیے۔ یہ مرزا غالب پر پہلی اور آخری مکمل فلم تھی جسے گولڈ میڈل بھی ملا اور کلاسک میں شمار کی گئی۔ ۱۲ غزلیں مرزا غالب کی ہیں۔ ضرورت کے مطابق دو گیت اور قوالی شکیل بدایونی نے لکھے تھے۔ غلام محمد کی بطور موسیقار یہ یادگار فلم ہے۔

۱۹۵۹ء فلم 'میں نشے میں ہوں' اوما پکچرز بمبئی، ہدایت: نریش سہگل، موسیقی: شنکر جے کشن، گیت کار: شیلیندر اور حسرت جے پوری، اداکار: راج کپور، مالا سنہا، مبارک، لیلا چٹنس، نذیر حسین، دھومل، ماروتی، ہیلن، ٹن ٹن بابو۔

(۱)

یہ نہ تھی ہماری قسمت کہ وصالِ یار ہوتا
اگر اور جیتے رہتے یہی انتظار ہوتا

آواز: اوشا منگیشکر

نوٹ: اس غزل کو رقاصہ بیلا بوس پر مجرے میں فلمایا گیا تھا۔

۱۹۶۳ء فلم 'بیگانہ' سداشو چترا بمبئی، ہدایت: سداشو جے راؤ کوی، موسیقی: سپن جگموہن، گیت کار: شیلیندر، اداکار: سپریہ چودھری، دھرمیندر، سیلیش کمار، مادھوی، منوہر ماتھر، دین بوس، آغا۔

(۱)

یہ نہ تھی ہماری قسمت کہ وصالِ یار ہوتا
اگر اور جیتے رہتے یہی انتظار ہوتا

(۲)

کوئی میرے دل سے پوچھے ترے تیرِ نیم کش کو
یہ خلش کہاں سے ہوتی جو جگر کے پار ہوتا

آواز: محمد رفیع

۱۹۶۵ء فلم 'آسمان محل' نیا سنسار بمبئی، ہدایت: خواجہ احمد عباس، موسیقی: جے پی کوشک، گیت کار: علی سردار جعفری، غالب، مجاز، اداکار: پرتھوی راج، سریکھا، نانا پلسیکر، رشید خان، یونس پرویز، دلیپ راج، انور حسین۔

(۱) 'لا دو پیالہ میں شرابی ہوں'۔

آواز: مہیندر کپور، وجیا کمار اور ساتھی

نوٹ: یہ گیت علی سردار جعفری نے لکھا تھا۔ اس گیت میں غالب کے اشعار کو بھی استعمال کیا گیا تھا۔

۱۹۷۲ء فلم 'شاعرِ کشمیر مہجور' پربھات مکرجی کلکتہ، ہدایت: پربھات مکرجی، موسیقی: پریم دھون، گیت کار: کیفی اعظمی، پریم دھون اور غالب۔ اداکار: بلراج ساہنی، اجے ساہنی، کلپنا ساہنی، غلام محمد، پنڈت، غلام محمد صوفی۔

(۱)

پھر مجھے دیدۂ تر یاد آیا
دل جگر تشنۂ فریاد آیا

آواز: مہیندر کپور

یہ فلم کشمیر کے شاعر مہجور کی حیات و شخصیت پر بنی تھی لیکن ان کا کلام فلم میں نہیں لیا گیا تھا۔ سچویشن کے مطابق موسیقار پریم دھون نے خود بھی گانے لکھے تھے اور کیفی اعظمی سے بھی لکھوائے تھے۔ صرف مذکورہ غزل غالب کی لی گئی تھی۔

●●●

دوسری اور آخری قسط

تو ابھی راہ گزر میں ہے، قیدِ مقام سے گزر

علی گڑھ تحریک کو نئی معنویت کی تلاش

مظفر حسین سیّد (29/11، سرسیّد روڈ، دریا گنج، نئی دہلی-110002)
E-mail: syedmh92@yahoo.com

سرسیّد جدید و قدیم علوم کی ہم آہنگی کے حامی تھے، یہی سبب ہے کہ ان کی تعلیمات آج بھی تازہ ہیں فرسودہ نہیں ہوئی ہیں اور نہ ہی ان کی خدمات از کار رفتہ کے زمرے میں آتی ہیں۔ ان کی اثر اندازی، اہمیت و معنویت آج بھی برقرار ہے۔ یوں اُن کا خواب بڑی حد تک شرمندۂ تعبیر بھی ہوا۔ علی گڑھ کی پہلی نسل (یا کم از کم اس کی بالائی سطح) انگریزی اور جدید علوم کی ماہر بھی ہے اور اپنی دیرینہ اخلاقی روایات کی امین بھی۔ آج علی گڑھ برادری پورے عالم میں اپنی مادر درسگاہ کا نام روشن کررہی ہے، یہ دراصل اس عظیم ہستی کا کمال ہے، جس کا نام سرسیّد تھا۔ اگر خدانخواستہ کہیں سرسیّد جیسا مصلح پیدا نہ ہوتا یا ان کی تحریک کامیابی سے ہم کنار نہ ہوتی تو مسلمانانِ ہند آج بھی عہد وسطیٰ میں جی رہے ہوتے۔ سچ یہ ہے کہ سرسیّد جس انقلاب کے داعی و نقیب تھے، وہ محض ایک تعلیمی انقلاب نہیں تھا، بلکہ انقلابِ دانش تھا، قومِ مسلم کو حبِ دانش کی دعوت تھی اور حصول علم و عرفان اُن کا مقصد جلیل الشان تھا۔

سرسیّد نے اپنی قوم کے لیے جو خواب دیکھا تھا، وہ کوئی معمولی خواب نہیں تھا۔ وہ علی گڑھ میں صرف ایک دانش گاہ کے قیام کے خواہش مند نہیں تھے بلکہ ایک مسلم آکسفورڈ یا مسلم کیمبرج کا قیام ان کے پیش نظر تھا، اپنے سفر انگلستان اور مطالعہ طرز مغربی کی بنیاد پر ہی انھوں نے علی گڑھ کالج کی بنیاد رکھی تھی۔ مزید یہ کہ ان کا خواب صرف ایک عدد تعلیم گاہ قائم کرنے تک محدود نہیں تھا بلکہ وہ اسی طرز پر ملک کے طول و عرض میں مسلمانوں کے تعلیمی ادارے قائم کرنے کے آرزومند تھے، جو ان کی حیات میں ممکن نہ تھا، تاہم مقام اطمینان و مسرت ہے کہ جب اس خواب کی تکمیل کے لیے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے ذیلی تعلیمی مراکز ملک کے کئی گوشوں میں قائم ہورہے ہیں، یہ ایک اہم پیش رفت ہے، کیونکہ مسلمانوں کے اداروں کا جابجا قیام اور ان کی ترویج و ترقی اس دانش گاہ عظیم کے بنیادی مقاصد میں شامل ہیں۔

یہاں اس تاریخی حقیقت کا اعادہ کرنا ضروری ہے کہ جب سرسیّد کو وائسرائے کی قانون ساز کونسل کے رکن کی حیثیت سے تعلیمی کمیشن کے سامنے اپنا نقطۂ نظر رکھنے کا موقع ملا تو انھوں نے پورے ملک کے مختلف شہروں میں اسکول اور کالج کھولنے کی تجویز پیش کی تھی۔ دراصل ان کی سوچ اور ان کے منصوبے کسی حد ود میں نہیں تھے بلکہ وسیع تر تھے۔

سرسیّد کی وسعت نظر و وسعت عمل کی حامل تھی، جس کا عملی ثبوت انھوں نے بار بار دیا۔ سرسیّد کی دور رس و دور بینی بے مثل تھی، وہ اتنی دور تک دیکھ سکتے تھے، جہاں تک پرواز میں دوسروں کی سوچ کے پر جلتے تھے۔ تقریباً ایک سو پچاس برس پہلے انھوں نے افق عالم پر جو روشنی دیکھی تھی، وہ اس وقت کے اکثر علما اور عام دانشوروں کی نظروں سے اوجھل تھی، اسی روشنی کے حصول کے لیے انھوں نے ایک عظیم دانش گاہ کا خواب دیکھا، جو شرمندۂ تعبیر بھی ہوا، ان کا منصوبہ بڑی رفعتوں تک رسا ہوا، تاہم ابھی ان کے کئی خواب بے تعبیر ہیں اور ان کے منصوبے عمل مسلسل کے منتظر۔ ان کی تحریک اور ان کے مشن کو جاری رکھنے کی ضرورت ہے اور یہ ضرورت آج بھی اتنی ہی شدید اور متقاضائے تکمیل ہے، جتنی کہ روز اوّل تھی، ہر چند کہ گزشتہ دو صدیوں میں بہت کچھ بدلا ہے، مگر ابھی بہت کچھ بدلنا باقی ہے۔ مسلمانوں کی تعلیمی و معاشرتی حالت بلاشبہ کچھ نہ کچھ بہتر ہوئی ہے مگر ان کی کثیر آبادی آج بھی پس ماندہ ہے۔

اب اسے ستم ظریفی نہیں تو کیا کہا جائے گا کہ برطانوی حکومت نے تعلیمی جائزے کے لیے ۱۸۸۲ء میں ہنٹر کمیشن قائم کیا تھا، اس کمیشن کی رپورٹ میں ڈبلیو۔ ڈبلیو ہنٹر نے دیگر طبقات کے علاوہ مسلمانوں کو بالخصوص تعلیمی و سماجی طور پر پسماندہ قرار دیا اور ہندستانی مسلمانوں کے کوائف پر اپنی مشہور کتاب میں بھی مسلمانوں کی حالت زار کا ذکر کیا۔ اس کے ایک صدی بعد جب منڈل کمیشن کی رپورٹ آئی تو اس میں دیگر طبقات کی پس ماندگی کے علاوہ مسلمانوں کی پسماندگی کی تفصیل بھی تھی، اور ان کی بہت سی برادریوں کو زمرۂ پس ماندگی کے تحت ملازمتوں، تعلیم گاہوں میں محفوظ نشستوں کا حقدار قرار دیا گیا تھا، جسے حکومت ہند نے بڑے پس و پیش کے بعد نافذ بھی کیا۔ پھر اس کے تقریباً دو عشروں بعد سچر کمیٹی کی رپورٹ آئی، جو خالصتاً مسلمانوں کے حالات کے جائزے پر مبنی تھی۔ جب یہ رپورٹ عام ہوئی تو یہ نہ صرف مسلمانوں بلکہ پورے ملک اور خود حکومت کے لیے چشم کشا ثابت ہوئی۔ جسٹس سچر کی فراہم کردہ معلومات کے بموجب، عام مسلمان ملک کے دلتوں سے بھی زیادہ پس ماندہ تھے۔ افسوس کہ سوا صدی میں کچھ بھی نہیں بدلا، ورنہ ہنٹر کمیشن، منڈل کمیشن اور سچر کمیٹی کی سفارشات میں ایسی حیرت انگیز یکسانیت نہ ہوتی۔ سابقہ حکومت اس سمت میں کچھ کررہی تھی، اور موجودہ حکومت شاید کچھ کرنا چاہتی ہے یا نہیں، یہ الگ مسئلہ ہے اور باقاعدہ بحث یا گفتگو کا متقاضی، سردست راقم یہ عرض کرنا چاہتا ہے کہ بحیثیت مسلمان ہمیں بھی اپنا ملی و دینی فریضہ ادا کرنا چاہیے۔ مذکورہ تمام معلومات اور سفارشات اس حقیقت کا اعادہ کرتی ہیں کہ سرسیّد نے جن حالات میں اپنی تحریک کا آغاز کیا تھا، وہ حالات بیشتر کسی بڑی حد تک ویسے ہی ہیں، اور ان کی تحریک کو جاری رکھنا اور رفتار دینا موجودہ وقت کی اہم ترین ضرورت بلکہ ملت کی ضروریات میں سب سے اہم اور اولین اہمیت کی حامل ہے۔

ایک مسلّمہ قانونِ فطرت ہے کہ عظیم قائدین و پیشوایانِ قوم کے خلفاء، مقلدین و معتقدین بھی تعداد کثیر میں ہوتے ہیں، نیز اپنی وابستگی اور وفاداری کے تحت مخلص بھی اور وہی اپنے رہبر، اپنے قائد کے نامکمل منصوبوں کی تکمیل کرتے ہیں۔ سرسیّد کے رفقا و جانشینوں نے بھی ان کی تحریک کو نہ صرف جاری رکھا بلکہ وسعت بھی دی جس کے نتائج منظر عام پر آئے اور خوب آئے، اسی لیے، ان کا شمار مشاہیر علی گڑھ میں ہوتا ہے۔ (تفصیل سے ایک مرتبہ پھر گریز، دراصل سرسیّد کے رفقا کی خدمات بھی ایک علاحدہ طویل مضمون کی متقاضی ہیں)۔ حیف کہ یہ سلسلہ کب کا موقوف ہوچکا۔

یہ ایک روشن حقیقت ہے کہ سرسیّد کی تحریک تعلیمی، ان کے جہاد علمی و معاشرتی، غرض ان کی تمام تر مساعی مبارکہ کا عروج مسلم یونیورسٹی کے قیام کی شکل میں ظہور پذیر ہوا، لیکن دوسری تلخ حقیقت یہ ہے کہ یہ ان کے خواب کی محض جزوی تعبیر ہے، اس کی تکمیل نہیں، اس لیے کہ ان کا خواب اس تعبیر سے کہیں وسیع تر، وسیع تر اور مزید اعلا و ارفع تعبیرات کا طلب گار ہے۔ ان کے مقاصد جلیلہ صرف ایک علمی دانش گاہ کے قیام سے کہیں بلند تھے۔ وہ ہندستان کے ہر اہم شہر میں اعلیٰ تعلیمی درس گاہوں، نیز ہر ممتاز قصبے میں ثانوی و ابتدائی درس گاہوں کے قیام کے متمنی تھے، اگرچہ یہ قید حیات ان وسیع تر اور عملاً مستبعد اقدامات کے حامل ان کے تمام منصوبوں کی تکمیل ممکن نہ تھی، اسے تو آنے والی صدیوں اور تمام زمانوں میں جاری رہنا تھا مگر افسوس کہ یہ عمل جمود کا شکار ہوکر رہ گیا۔ آج سرسیّد کا کوئی نام لیوا ان کی تحریک کی عملی توسیع کے لیے کوئی منصوبہ بند کاوش نہیں کررہا ہے۔

عظیم افکار کی ایک خوبی یہ ہے کہ وہ زمان و مکاں کی قید سے ماورا ہوتے ہیں۔ ان کا کوئی عصر نہیں ہوتا، اور نہ ہی کبھی ان کا زمانہ ختم ہوتا ہے۔ یہی بات سرسیّد کی فکر، ان کے فلسفے اور ان کے مقاصد پر حرف بہ حرف صادق آتی ہے۔ جیسا کہ عرض کیا گیا، ان کے مشن کی آج بھی اتنی ہی ضرورت ہے جتنی کہ روز اوّل تھی، ایک حکیم نے قوم کے مرض کی تشخیص کرکے ڈیڑھ صدی قبل جو نسخۂ کیمیا تجویز کیا تھا، وہ آج بھی موثر و کارگر ہے۔ اس کے رہنمایانہ نکات وقت کے ساتھ نہ فرسودہ ہوئے ہیں، نہ ناقابل عمل، ان کی افادیت آج بھی مسلّم ہے۔ اگر عام مسلمانوں کو تعلیمی، ذہنی و معاشرتی پسماندگی کے غار عمیق سے باہر نکالنا ہے تو سرسیّد کی تحریک کو از سر نو زندہ کرنا اور ان کے مشن کو جاری رکھنا ہی ہمارے ماہرین تعلیم اور ملی قائدین کا نصب العین ہونا چاہیے۔ آج اگر مسلمانوں کی تعلیمی پسماندگی پر غور کریں تو صورت حال خاصی تشویش ناک نظر آتی ہے۔ سرکاری کمیشنوں کی رپورٹیں، مختلف آزاد اداروں کے جائزے، دیگر تعلیمی ماہرین کے اخذ کردہ نتائج اس امر کے شاہد ہیں کہ ابھی مسلمانوں کی شرح خواندگی ملکی شرح سے خاصی کم ہے۔ (یہاں یہ بھی ملحوظ رہے کہ عملی طور پر خواندہ کے معنی تعلیم یافتہ نہیں، بحر حال خواندہ ہر وہ فرد معاشرہ ہے جو کسی ایک

(بقیہ صفحہ ۷ پر)

اردو دُنیا

تلنگانہ کے انگریزی میڈیم مدارس میں اردو کو لازمی مضمون بنانے کا منصوبہ

جدہ (۳۰ ستمبر)۔ ریاست تلنگانہ کے نائب وزیر اعلیٰ جناب محمد محمود علی نے آج اردو اکیڈمی جدہ کی ویب سائٹ www.urduacademyjeddah.com لانچ کی اور کہا کہ ریاست تلنگانہ میں اردو زبان کو ہر مقام پر ترجیح دیے جانے اور اس کی ترقی و ترویج کے لیے حکومت کی جانب سے موثر عمل آوری کی جارہی ہے۔ انھوں نے اعلان کیا کہ اس سلسلے میں ان کی حکومت کا پہلا اقدام تمام انگریزی میڈیم مدارس میں اردو کی لازمی تعلیم ہوگی۔ حج کے فریضے کی ادائیگی کے لیے آئے ہوئے ڈپٹی چیف منسٹر تلنگانہ جناب محمد محمود علی نے اردو اکیڈمی جدہ کی ویب سائٹ کے افتتاح کے بعد کہا کہ وہ اس اکیڈمی کی خاموش اور تعمیری اردو خدمات سے بخوبی واقف ہیں۔ قبل ازیں اکیڈمی کے صدر جمال قادری نے کہا کہ جناب محمود علی نے حج پر تشریف لانے کے باوجود اپنے قیمتی لمحات میں سے کچھ وقت اردو کے لیے عنایت کیا۔ اس موقع پر انھوں نے محمود علی صاحب کو ریاست تلنگانہ میں اردو زبان کی ترویج و اشاعت کے لیے اور اردو میڈیم مدارس کی زبوں حالی دور کرنے کے لیے چند تجاویز پر مشتمل ایک یادداشت پیش کی۔ سلیم فاروقی نے ویب سائٹ کے متعلق تفصیلات سے آگاہ کرتے ہوئے کہا کہ اردو اکیڈمی جدہ کے رکن عاملہ اور معاون ڈیجیٹل میڈیا سید شمس الدین قادری حسنی کی شبانہ روز محنت اور مرزا قدرت اللہ بیگ کے تعاون سے یہ ویب سائٹ نہایت ہی مختصر عرصے میں تیار ہوگئی۔ اس ویب سائٹ میں اردو اکیڈمی جدہ کی کارکردگی کی تفصیلات کے علاوہ زبان اردو، مولانا ابوالکلام آزاد اور ہندوستان کے مجاہدین آزادی کے بارے میں اجمالی اہم معلومات فراہم کی گئی ہیں۔ شیخ ابراہیم کی ادارت میں ۲۰۰۱ء سے تواتر شائع ہونے والے سالانہ "آزاد سوینیر" کے تمام مجلے بھی عنقریب اس ویب سائٹ پر دستیاب ہوں گے۔ پروگرام کوآرڈینیٹر خالد حسینی نے اس تقریب کا اہتمام کیا۔ اس تقریب میں جدہ کی دیگر ممتاز شخصیتوں کے علاوہ مہمان اعزازی کے طور پر مشہور سعودی جرنلسٹ محترمہ سمیرہ عزیز، افنان انٹرنیشنل اسکول کی سابق پرنسپل محترمہ نجمہ سلطانہ اور ڈپٹی چیف منسٹر کے برادر جناب محمد علی نے شرکت کی۔

(اعتماد، حیدرآباد)

ضلع کھمم میں بھی اردو کو دوسری سرکاری زبان بنانے کی کوشش

حیدرآباد (یکم اکتوبر)۔ تلنگانہ کی حکومت ضلع کھمم کو ان اضلاع کی فہرست میں شامل کرنے پر غور کررہی ہے جہاں اردو کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ دیا گیا ہے۔ فی الحال تلنگانہ کے ۹ اضلاع میں اردو کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ حاصل ہے۔ تلنگانہ کے نائب وزیر اعلیٰ محمد محمود علی اس سلسلے میں خصوصی دل چسپی رکھتے ہیں اور ان کی کوششوں سے محکمہ اقلیتی بہبود کی جانب سے یہ تجویز پیش کی گئی ہے۔ توقع ہے کہ اس سلسلے میں فیصلہ محمود علی کی حج سے واپسی کے بعد ہوگا۔ تلنگانہ کی تشکیل سے پہلے متحدہ آندھرا پردیش کے 15 اضلاع میں اردو کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ دیا گیا تھا۔ ان میں موجودہ آندھرا پردیش کے ۵ اضلاع اننت پور، چتور، کڈپہ، کرنول، نیلور کے علاوہ تلنگانہ کے ۹ اضلاع سوائے کھمم شامل تھے۔ کھمم میں اردو بولنے والوں کی ایک بڑی تعداد ہے اس کے باوجود ۲۰۰۷ء میں اردو کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ دینے کے لیے جاری کردہ سرکاری احکام میں ضلع کھمم کو شامل نہیں کیا گیا۔ تلنگانہ کی تشکیل اور ٹی آر ایس کے برسر اقتدار آنے کے بعد کھمم میں بھی اردو کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ دینے کی کوششوں سے مطالبہ کیا جارہا ہے۔ دوسری طرف تلنگانہ کے ۹ اضلاع میں اردو کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ دینے کے لیے جاری کردہ احکام پر عمل آوری سست رفتاری سے کی جارہی ہے۔ حیدرآباد اور نظام آباد کے کلکٹریٹ کے علاوہ دوسرے اضلاع میں اردو میں دی گئی درخواستوں پر کوئی توجہ نہیں دی جارہی ہے۔ اسی طرح کئی سرکاری دفاتر اور آر ٹی سی بسوں میں اردو کے سائن بورڈ نہیں دیکھے جارہے ہیں۔ اردو کے کئی سرکاری مدارس کی حالت بھی کافی خستہ ہے۔ ان اسکولوں میں بنیادی سہولتوں کی کمی ہے، کئی مضامین کے اساتذہ بھی نہیں ہیں۔

(سالار، بنگلور)

اردو کو روزی روٹی سے جوڑنا ہے

اردو اکادمی کی اعزازی تقریب سے وزیر اعلیٰ اکھلیش یادو کا خطاب

لکھنؤ (۲۸ ستمبر)۔ ریاستی حکومت کی کوشش ہے کہ تمام ہندوستانی زبانوں کو فروغ حاصل ہو، ان کے لکھنے پڑھنے والوں کو اعزاز ملے۔ سماج وادی پارٹی نے ہمیشہ سبھی زبانوں کا احترام کیا ہے، کسی زبان کے ساتھ تفریق نہیں کی۔ ہندی، سنسکرت کے جو اعزاز و انعام بند ہوگئے انھیں دوبارہ شروع کرایا۔ اردو، ہندی، سنسکرت تینوں زبانیں عوام کو جوڑتی ہیں۔ اردو محبت کی زبان ہے، اس سے ہمارے سماج میں اتحاد پیدا ہوتا ہے۔ بولنے والے اردو ہندی کا فرق نہیں کرتے۔ ہم بھی بولتے بولتے کب اردو بولنے لگے پتا ہی نہیں چلتا۔ تجربہ ہے کہ وہی زبانیں آگے بڑھتی ہیں جو دوسری زبانوں کے الفاظ بھی اختیار کرتی ہیں۔ ان خیالات کا اظہار وزیر اعلیٰ اکھلیش یادو نے ۲۸ ستمبر کو گومتی نگر واقع اندرا اکادمی پرتشٹھان میں اردو اکادمی کی اعزازی تقریب میں کیا۔ ریاستی و ضلع سطح پر اردو مضمون میں ہائی اسکول و انٹرمیڈیٹ میں ٹاپ کرنے والے بچوں اور ان کے اساتذہ کے اعزاز کے لیے منعقد تقریب میں جہاں اکادمی کی جانب سے ہائی اسکول کے طلبہ کو چار ہزار روپے، انٹرمیڈیٹ کے طلبہ کو پانچ ہزار روپے کا چیک، توصیفی سند اور ایک ہزار روپے کی اردو کتب بطور انعام دی گئیں وہیں وزیر اعلیٰ کی جانب سے اردو کے تمام ٹاپر طلبہ کو لیپ ٹاپ بھی دیے گئے۔

(اردو ایکشن، بھوپال)

استنبول یونیورسٹی کی اردو کی طالبات کا دورۂ اے ایم یو

طالبات کو اے ایم یو میں دوران قیام اردو کا قلیل مدتی کورس کرایا جائے گا

علی گڑھ (۱۰ اکتوبر)۔ استنبول یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کی بی اے کی طالبات کا ایک 7 رکنی وفد آج علی گڑھ مسلم یونیورسٹی پہنچا۔ وفد میں ۵ طالبات کے علاوہ ایک نگراں شامل ہیں۔ اے ایم یو کے شعبۂ اردو کا سینٹر آف ایڈوانسڈ اسٹڈی ان طالبات کو ایک قلیل مدتی کورس کرائے گا جس میں انھیں اردو زبان بولنے، لکھنے اور پڑھنے کی مشق کرائی جائے گی۔ اس کے علاوہ شعبے کے اساتذہ کے خصوصی لیکچرز کا بھی اہتمام کیا جائے گا۔

سینٹر آف ایڈوانسڈ اسٹڈی کے کوآرڈینیٹر پروفیسر محمد زاہد نے بتایا کہ اردو زبان سیکھنے میں ان طالبات کی سہولت کے پیش نظر انھیں اردو طالبات کے ساتھ ہی رکھا جائے گا تاکہ وہ زیادہ سے زیادہ وقت اردو زبان کا استعمال کرسکیں۔ انھوں نے بتایا کہ استنبول کی ان طالبات کا وفد اے ایم یو میں ڈیڑھ ماہ قیام کرے گا اور انھیں آگرہ، لکھنؤ اور دہلی کے تاریخی و تہذیبی مقامات کی سیر بھی کرائی جائے گی۔

پروفیسر محمد زاہد نے بتایا کہ شعبۂ اردو میں یہ اپنی نوعیت کا ایک جدید کورس ہے جو غیر ملکی طلبہ کے لیے خصوصی طور پر تیار کیا گیا ہے۔ انھوں نے بتایا کہ وائس چانسلر لیفٹننٹ جنرل ضمیر الدین شاہ نے اس کورس کی اہمیت کے پیش نظر نہ صرف اس کو منظوری دی بلکہ ترکی سے آنے اس وفد کے طعام و قیام کا بھی نظم کیا ہے۔ انھوں نے بتایا کہ پرووائس چانسلر بریگیڈیر سید احمد علی نے اس کورس میں خصوصی طور پر دل چسپی لیتے ہوئے دہلی ایئرپورٹ سے ان طالبات کے لیے علی گڑھ آنے کے لیے یونیورسٹی کی جانب سے ایک بس مہیا کرائی۔

(اردو ایکشن، بھوپال)

اردو میڈیم اسکولوں میں خالی اسامیوں کو پُر کیا جائے

نظام آباد، تلنگانہ (۱۰ اکتوبر)۔ آل انڈیا آئیڈیل ٹیچرس اسوسی ایشن نظام آباد یونٹ کے صدر جناب محمد اسحاق حسین نے ایک صحافتی بیان میں ریشنلائزیشن سے اردو میڈیم کو استثنیٰ دینے اور DSC 2008 اور DSD 2012 سے فوری روسٹر سسٹم برخاست کرنے کا پُرزور مطالبہ کیا۔ RTE کے تحت حکومت نے اسکول کے اوقات میں تو تبدیلی کی ہے لیکن افسوس کہ RTE کے تحت اردو میڈیم اسکولوں میں مطلوبہ اسامیوں پر تقرر میں تساہلی کا مظاہرہ کررہی ہے۔ اساتذہ نہ ہونے کی وجہ سے طلبہ خانگی اسکولوں کا رخ کررہے ہیں۔ نظام آباد کے لیے 112 اکیڈمک انسٹرکٹر اردو میڈیم کے لیے منظور کیے گئے جو صرف اور صرف پرائمری اور اپر پرائمری اسکولوں میں مقرر کیے گئے جب کہ اردو میڈیم کے ہائی اسکولوں کو نظر انداز کردیا گیا۔ کئی ایک اردو میڈیم کے ہائی اسکولس ایسے ہیں جہاں مضمون واری ٹیچرس نہیں ہیں بالخصوص ریاضی، سائنس جیسے مضامین کے ٹیچرس نہیں ہیں۔ CCE ماڈل کے تحت نئی درسی کتب آگئی ہیں اس کے ماڈیولس صرف تلگو میں فراہم کیے جارہے ہیں جس سے اردو میڈیم ہائی اسکولوں کے ٹیچرس کو مشکلات پیش آرہی ہیں۔ انھوں نے SCERT کے ڈائرکٹر جناب جگدیشور ریڈی سے مطالبہ کیا کہ فوری سائنس اور ریاضی کے ماڈیولس اردو میں فراہم کیے جائیں۔ ۱۳ اکتوبر سے شروع ہونے والے SA1 میں کئی ہائی اسکولس ایسے ہیں جہاں طلبہ ریاضی کی کتاب کھول کر بھی دیکھ نہیں سکے کیونکہ ریاضی کا ٹیچر نہیں ہے۔ ضلع پریشد ہائی اسکول بودھن میں 25 سال سے سائنس علم پڑھانے کے لیے ٹیچر نہیں ہے۔ اردو میڈیم ہائی اسکولوں میں مزید 100 اکیڈمک انسٹرکٹرز کی ضرورت ہے۔ SSA کی جانب سے سرکاری اسکولوں کی مانیٹرنگ کے لیے قائم کردہ Task Forces کا نام تبدیل کرنے کا انھوں نے مطالبہ کیا۔ انھوں نے چیف منسٹر تلنگانہ جناب چندر شیکھر راؤ، ڈپٹی چیف منسٹر جناب محمود علی، رکن پارلیمان نظام آباد کے کویتا سے پُرزور مطالبہ کیا کہ اردو کے لیے Spl. DSC رکھا جائے اور نظام آباد میں مطلوبہ 595 اسامیوں پر فوری تقرر کیے جائیں۔

(رہنمائے دکن، حیدرآباد)

گرامی نامے

ادارے کا مراسلہ نگاروں سے متفق ہونا ضروری نہیں ہے

قومی اردو کونسل کی تشکیلِ نو...

مکرمی! 'ہماری زبان' کے ۸ تا ۱۴ اکتوبر ۲۰۱۴ء کے شمارے میں آپ کا مضمون 'قومی اردو کونسل کی تشکیل نو اور مستقبل کا لائحہ عمل' نظر سے گزرا۔ آپ کے مضمون کے ہر ایک لفظ اور ایک ایک حرف سے حق گوئی اور بے باکی کا مظاہرہ ہو رہا تھا۔ یہ تو پہلی قسط ہے، آگے آگے دیکھیے ہوتا ہے کیا۔ میں ہر اس تحریر و تقریر کو لائق اعتنا سمجھتا ہوں جو ہمارے اندر غور و فکر کی تحریک پیدا کر کے لوگوں کو بیدار کر دے اور مجھے خوشی ہے کہ آپ کے خیالات جو مضمون کی شکل میں میرے سامنے ہیں اس کسوٹی پر کھرے اترتے ہیں۔ آپ نے بڑی وضاحت اور صاف گوئی سے باتیں کہہ دی ہیں، اس سے زیادہ کوئی اور کیا کہہ سکتا ہے۔ کیا زمانہ تھا جب سیاست داں دانشور اور قابل لوگوں کی صحبت پسند کرتے تھے اور عجیب دور آیا ہے کہ ہر شخص چاپلوسوں اور خوشامدیوں سے گھرا رہنے میں عافیت سمجھتا ہے۔ آپ نے جن باتوں کی طرف اشارہ کیا ہے اگر انھیں پیش نظر نہیں رکھا گیا تو یقیناً تشکیل نو کا حشر وہی ہوگا جو آپ نے بیان کیا ہے، کیوں کہ اب کسی سیاست داں کو فرصت نہیں ہے جو اہل لوگوں کو سامنے لائے۔ یہ حال تو اس سیاسی جماعت کے لوگوں کا تھا جو اقلیتوں کی زبان اور تہذیب کی محافظ بھی جاتی تھی۔ جو دعویٰ ہی نہیں کرتے ان سے کیا توقع۔ راجستھان میں کانگریس کے زمانے میں اشوک گہلوت صاحب نے اردو اکادمی کی تشکیل کی بھی تو حکومت کے چار سال گزر جانے کے بعد اور اس میں سترفیصد ممبران وہ تھے جن کا اردو تہذیب اور زبان و ادب سے کوسوں دور کا بھی واسطہ نہیں تھا اور بیشتر اردو رسم خط سے ناواقف تھے۔ ممبران میں اردو کے ایک پروفیسر بھی تھے جو راجستھان کی سات یونیورسٹیوں میں واحد منتخب پروفیسر ہیں، مگر ان کے مقابلے میں ایک ایسے شخص کو متفقہ طور پر وائس چیئرمین منتخب کیا گیا جن کا شین قاف بھی درست نہیں تھا، پھر بھلا ایسے میں اچھے کام کرنے والے لوگ سامنے آئیں بھی تو کیسے۔ اب راجستھان میں بھاجپا کی سرکار ہے، دوسری زبانوں کی تمام اکادمیوں کے کام کاج بخوبی انجام دیے جا رہے ہیں مگر اردو اکادمی نہ وہاں دوسری اکادمیوں کی طرح کل وقتی سکریٹری ہے، جو سرکار کے جانے کے بعد بھی کام کر رہا ہے۔ اردو اکادمی کا منیجر بھی نئے مدیر کے انتظار میں خاموش ہو جاتا ہے۔ اردو والوں کی بے حسی کا عالم آپ بیان کر چکے اس سے زیادہ میں کیا کہوں، لیکن آپ کے خیالات سے متاثر ہو کر سب کچھ لکھ دیا۔ یہ تو نہیں کہوں گا کہ آپ کی آواز صدا بہ صحرا ثابت ہوگی، یہ بھی نہیں کہوں گا کہ آپ کی صدا گھٹی نقار خانے میں طوطی کی آواز بن کر رہ جائے گی۔

پروفیسر محمد فاروق بخشی (سی-۲۵، ہاؤسنگ بورڈ کالونی، ...، راجستھان)

ملک میں اقلیتوں کے بچے مادری زبان میں تعلیم حاصل کرنے سے محروم

لسانی اقلیتوں کے قومی کمیشن نے اپنی پچاسویں رپورٹ میں کیا انکشاف

نئی دہلی (یو این آئی): آئین ہند نے بچوں کی نفسیات کا خیال رکھتے ہوئے ابتدائی تعلیم ان کی مادری زبان میں دینے کی ہدایت کی ہے لیکن ملک کی آزادی کے نصف صدی سے زیادہ عرصہ گزر جانے کے باوجود بیشتر اسکول نہ صرف اس کی ان دیکھی کر رہے ہیں بلکہ بچوں پر زیادتی کرتے ہوئے ان پر اپنی مرضی کی زبان پڑھنے کے لیے مجبور کر رہے ہیں۔ ہندوستان میں لسانی اقلیتوں کے قومی کمیشن نے اپنی پچاسویں رپورٹ میں واضح لفظوں میں کہا ہے کہ آئین ہند کی دفعہ 350A میں یوں تو تمام ریاستی حکومتوں اور مقامی انتظامیہ سے توقع کی گئی ہے کہ وہ لسانی اقلیتوں سے تعلق رکھنے والے بچوں کی پرائمری سطح پر تعلیم ان کی مادری زبان میں فراہم کرنے کے لیے ٹھوس اقدام کریں گی لیکن آزادی کے 68 برس گزر جانے کے باوجود اس پہلو سے صورت حال مایوس کن ہے اور اس تشویش ناک صورت حال کا تقاضا ہے کہ ریاستی حکومتیں اسے سدھارنے کے لیے فوری اقدام کریں۔ کمیشن کے چیئرمین پروفیسر اختر الواسع کے دستخط سے جاری اس رپورٹ میں جسے پچھلے دنوں اقلیتی امور کی وزیر نجمہ ہیبت اللہ نے پارلیمنٹ میں پیش کیا، سفارش کی گئی ہے کہ اسکولوں میں داخلہ فارم میں بچے کی مادری زبان، جس زبان میں وہ پڑھنا چاہیں اور سہ لسانی فارمولے کے تحت دوسری زبان اختیار کرنے کے سلسلے میں واضح کالم ہونے چاہئیں تاکہ بچوں کو ان کی مادری زبان میں تعلیم کی سہولت کو یقینی بنایا جا سکے۔ بیشتر اسکول دستور ہند کی اس ہدایت کو نظر انداز کرنے کے لیے مختلف بہانے تلاش کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس کا اندازہ قومی دارالحکومت دہلی میں ایک این جی او کی طرف سے دائر کردہ آر ٹی آئی کے جواب سے بھی ہوتا ہے جس کے مطابق دہلی کے تقریباً 100 سرکاری اسکولوں میں مسلم بچوں کو سنسکرت پڑھنے کے لیے مجبور کیا جا رہا ہے۔ نواب حق ویلفیئر ایسوسی ایشن نئی دہلی نے دہلی حکومت کے ڈائرکٹوریٹ آف ایجوکیشن سے حق اطلاعات کے تحت جب یہ معلوم کیا کہ کتنے سرکاری اسکولوں میں مسلم بچوں کو اردو پڑھائی جا رہی ہے تو یہ حیرت انگیز انکشاف ہوا کہ دارالحکومت کے 100 سرکاری اسکولوں میں مسلم بچوں کو اردو کے بجائے سنسکرت پڑھنے کے لیے مجبور کیا جا رہا ہے۔

آر ٹی آئی کے جواب سے پتا چلا ہے کہ دہلی کے 100 سرکاری اسکولوں میں 14800 سے زائد مسلم بچے زیر تعلیم ہیں لیکن انھیں اردو پڑھانے کا کوئی انتظام نہیں ہے اور ان بچوں کو درجہ 6 سے 10 کے درمیان تیسری زبان کے طور پر مجبوراً سنسکرت کا انتخاب کرنا پڑتا ہے۔ آر ٹی آئی کے جواب سے یہ بھی پتا چلتا ہے کہ سروودیہ کنیا ودیالیہ سلطان پوری، اے بلاک میں 700 مسلم بچے ہیں، تاہم ڈائرکٹوریٹ آف ایجوکیشن کی ہدایت کے باوجود وہاں اردو پڑھانے کے لیے کسی ٹیچر کا انتظام نہیں کیا گیا ہے۔ لسانی اقلیتی کمیشن نے اس صورت حال کا نوٹس لیتے ہوئے دہلی حکومت کو ایک نوٹس جاری کیا ہے اور حالات کی انکوائری اور قانون کی خلاف ورزی کرنے والے ان اسکولوں کے خلاف کارروائی کرنے کی ہدایت دی ہے جہاں مسلم بچوں کو تیسری زبان کے طور پر سنسکرت اختیار کرنے کے لیے مجبور کیا گیا ہے۔ لسانی اقلیتوں کے قومی کمیشن کے اسسٹنٹ کمشنر نے نواب حق ویلفیئر ایسوسی ایشن کے صدر اسد غازی کی درخواست پر ۱۹ ستمبر کو دہلی کے ڈائرکٹوریٹ آف ایجوکیشن کے پرنسپل سکریٹری اشن شیو کمار کو نوٹس جاری کرتے ہوئے مناسب کارروائی کا حکم دیا ہے۔ واضح رہے کہ اگر

(بقیہ صفحہ ۷ پر)

رفتید ولے نہ از دل ما

دتیا (مدھیہ پردیش) کے معروف شاعر حبیب احمد خاں انجم ایک عرصے سے مختلف امراض میں مبتلا تھے۔ انھوں نے ۱۸ ستمبر ۲۰۱۴ء کی شب کو سوا گیارہ بجے آخری سانس لی۔ ۱۹ ستمبر کو بعد نماز جمعہ انھیں سپرد خاک کر دیا گیا۔ ان کا جنازہ ابھی قبرستان تک بھی نہ پہنچا تھا کہ ایک اور سانحہ رونما ہوا۔ مرحوم کی اہلیہ بخشی احمد کی حرکت قلب بند ہو جانے سے وفات ہو گئی اور چند گھنٹوں بعد ان کی تجہیز و تکفین بھی انجم کے قریب ہی کر دی گئی۔ یہ اطلاع ہمیں جناب وقار صدیقی (گوالیار) نے دی ہے۔

حبیب انجم پولیس اکادمی ساگر میں قانون کے لکچرر کی حیثیت سے یکم جنوری ۱۹۸۲ء کو ریٹائرڈ ہو کر اپنے آبائی وطن دتیا واپس آ کر وکالت کرنے لگے تھے۔ قانون کے مدرس کی حیثیت سے انھوں نے اس علاقے میں اتنی شہرت اور مقبولیت حاصل کی کہ پبلک سروس کمیشن کے امتحانات میں شرکت کرنے والے قانون کے امیدواروں کا ہجوم انھیں گھیرے رہتا اور وہ اپنی طویل علالت کے باوجود درس و تدریس کا کام انجام دیتے رہتے تھے۔

حبیب انجم کے دو شعری مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ پہلا 'ضمیر کی آواز' اور دوسرا 'سوز دروں'۔ یہ مجموعے محض ان کے دل و دماغ کا احوال نہیں ہیں بلکہ عام آدمی اور سارے سماج کی درد بھری حکایتیں ہیں۔ ان کی نظمیں سماجی، سیاسی اور اخلاقی ہر قسم کی برائیوں اور ناانصافیوں کے خلاف احتجاج کی لے سے لبریز ہیں، جو عام فہم زبان میں پیش کی گئی ہیں۔

حبیب انجم نے شاعری کے علاوہ اردو زبان و ادب کی خدمت بھی عملی طور سے کی۔ وہ دتیا کی قدیم انجمن 'بزم ادب' کے سکریٹری رہے۔ انجمن ترقی اردو کی لائبریری کے انچارج کی حیثیت سے نہ صرف انھوں نے اپنا قیمتی وقت صرف کیا بلکہ اپنے مکان کا ایک کمرہ بھی بغیر کرایہ کے لائبریری کے لیے وقف کر دیا تھا۔

اس سے قبل دتیا کا ایک اور اکیلا شاعر سیتا رام صابر انتہائی اذیت ناک حالات میں دنیا سے رخصت ہو گیا لیکن آخری وقت تک اپنی مثبت فکر کے ساتھ انسانی مسائل کو اپنی شاعری کا موضوع بناتا رہا۔ ان کی غزلیں سماجی سروکار اور انسانیت کے درد سے معمور ہیں۔ سیتا رام صابر کی بے نیازی کا یہ عالم تھا کہ انھوں نے اپنے کلام کو محفوظ رکھنے کی ضرورت کبھی محسوس نہیں کی۔ ادبی اور تہذیبی اداروں کی ذمہ داری ہے کہ وہ ان کے کلام کو یکجا کر کے شائع کریں۔

ادارہ 'ہماری زبان' ان دونوں مرحومین کے پس ماندگان کے غم میں برابر کا شریک ہے۔ (ادارہ)

مالیگاؤں میں پہلی بار

ای وی ایم پر امیدواروں کے نام اردو میں بھی ہوں گے

مالیگاؤں (۲۰ اکتوبر)۔ شہر کے سینٹرل حلقہ اسمبلی میں 90 فیصد مسلم ووٹروں کی اکثریت کو ملحوظ رکھتے ہوئے محکمہ انتخابات نے الیکٹرانک ووٹنگ مشینوں پر امیدواروں کے نام اردو زبان میں درج کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ سرکاری افسران کی اس پہل کو مثبت قرار دیتے ہوئے سیاسی پارٹیوں کے نامزد امیدواروں نے بھی ستائش کی ہے۔ اس سے قبل اسمبلی و پارلیمانی الیکشن کے دوران اردو میں فہرست رائے دہندگان جاری کرنے کے مطالبات ہو چکے ہیں جس پر عمل آوری تو نہیں ہوئی البتہ مرحلہ وار عمل آوری ہونے کے امکانات روشن ہو گئے ہیں۔ یہ پہلا موقع ہے جب مالیگاؤں کے رائے دہندگان جب ووٹ دینے جائیں گے تو انھیں ای وی ایم مشینوں پر امیدواروں کے نام اردو میں تحریر ملیں گے۔

اردو کے حوالے سے مالیگاؤں تعارف کا محتاج نہیں ہے۔ اردو اسکولوں، اردو اخبارات، اردو کے شعرائے کرام، صحافیوں کے علاوہ اس شہر کو اردو کے اقامتی و دینی مدارس کے حوالے سے بھی زبردست شہرت حاصل ہے۔ الیکشن ریٹرننگ آفیسر سندیپ پاٹل نے اخباری نمائندوں سے خطاب میں کہا کہ سینٹرل حلقہ اسمبلی میں 2 لاکھ 43 ہزار سے زائد ووٹروں کی مادری زبان اردو ہے، یہاں پر 90 فیصدی ووٹرس اردو لکھتے، بولتے، پڑھتے اور سمجھتے ہیں، الیکٹرانک ووٹنگ مشینوں پر امیدواروں کے نام بھی اردو میں تحریر کیے جائیں گے تاکہ رائے دہندگان کو آسانی رہے۔ واضح رہے کہ اس سے قبل محکمۂ انتخابات نے اخبارات کے لیے اردو میں اعلامیہ جاری کرنے کا نہ صرف فیصلہ کیا بلکہ اس پر عمل آوری بھی ہو رہی ہے۔

(اردو ایکشن۔ بھوپال)

نئی کتابیں

تبصرے کے لیے دو کتابوں کا آنا ضروری ہے

نام کتاب : بیاضِ رحمت
شاعر : مولوی رحمت علی رحمت
تدوین و ترتیب : خاور نقیب
ضخامت : ۱۲۸ صفحات
قیمت : ۱۵۰ روپے
ملنے کا پتا : ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، کوچہ پنڈت، لال کنواں، دہلی-۱۱۰۰۰۶
تبصرہ نگار : سعید اختر اعظمی
sakhtar0075@gmail.com

ڈپٹی نذیر احمد کا ناول 'توبۃ النصوح' اردو ناول کی ابتدائی تاریخ میں شاہکار کی حیثیت رکھتا ہے۔ اڑیسہ کے مولوی رحمت علی رحمت (ولادت 1891، وفات 1963) نے اس کے مقصدِ تخلیق معاشرتی اصلاح کو دیکھتے ہوئے ناول نگار کی اجازت لے کر اڑیا میں ترجمہ کیا اور اس کی رسائی عوام و خواص تک کرائی۔ ان کی دیگر تصنیفات میں 'جواہر القواعد' اور 'رفیق الحق' کی شمولیت ہے۔ ان میں اول الذکر اردو قواعد کی کتاب ہے جب کہ ثانی الذکر میں مذہبی رموز و نکات ہیں۔

رحمت علی رحمت فرصت کے اوقات میں میدانِ شعر و سخن میں بھی طبع آزمائی کرتے رہے جس کی یکجائی کو انھوں نے 'بیاضِ رحمت' کا نام دیا۔ یہ چوبی صندوق میں دیگر مطبوعہ و غیر مطبوعہ تصانیف کے ساتھ ان کے فرزندِ ارجمند کرامت علی کرامت کو بطور ورثہ ملی۔ خاور نقیب نے یہ نسخہ حاصل کر کے اسے جدید کتابت سے آراستہ کر کے قارئین کے روبرو کیا۔ بوسیدہ اوراق میں جو بھی اشعار درست حالت میں ملے انھیں من و عن درج کیا گیا ہے جب کہ جہاں دیمکوں نے کرم فرمائی کی ہے وہاں خالی جگہ چھوڑ دی گئی ہے۔ ان اشعار میں رنگِ تغزل، مذہبی عناصر، تلمیحات، طنز و مزاح اور تضمین کو جگہ دی گئی ہے۔ بطور نمونہ چند اشعار ملاحظہ ہوں:

حضرتِ دل کو جو سمجھایا تو یہ کہنے لگے
چھوڑ دو جلدی کہ ارمان ہے مٹ جانے کا

زندگی کے برسوں فلسفہ تاریک دل کو کر چکا
تھیں اہلِ وفا کی رہبر جہاں ہو گئیں

یہ جلوے حسن کے سارے جہاں میں
مظاہر ہیں وہ نور حق کے

تری رحمت کی بارش سے وہ عالم سبز ہوتا ہے
عجب کیا دل بھی میرا گلشن بے خار ہو جائے

راز سوز دروں نہیں کھلتا
آہ کی گرچہ ترجمانی ہے

اب راز دارئ دہان بہار نہیں رہے
سب ناخنوں کو اک شریان کھا گئے

یہ شاعری ریاضی داں، اڑیا و انگریزی کی کئی درسی کتب کے مصنف رحمت علی رحمت کی فکری بالیدگی کا اشاریہ ہے جو عروضی سطح پر خنافی وجزر کا اظہار یہ بھی ہے۔ بہرکیف گمنامی کی نذر ہو جانے والے قلم کاروں کی تخلیق بازیافت کا یہ سلسلہ قابلِ ستائش ہے۔

⊙⊙⊙

نام کتاب : مدھیہ پردیش میں
اردو تحقیق
مرتب : عتارِ شمیم
ضخامت : ۳۳۲ صفحات
قیمت : ۲۰۰ روپے
ناشر : مصنف، ۱۰، کوئنس ہوم احمد آباد پیلس روڈ، کوہِ فضا، بھوپال-۴۶۲۰۰۱
تبصرہ نگار : دیپک بدکی
deepak.budki@gmail.com

ڈاکٹر عتارِ شمیم اندور کے گورنمنٹ پوسٹ گریجویٹ کالج میں شعبۂ اردو میں پروفیسر رہے ہیں۔ زیرِ نظر کتاب کو ترتیب دینے کی تحریک انھیں ۱۹۹۵ء میں اسی موضوع پر ہوئے سیمینار کے دوران ملی تھی مگر کچھ وجوہ کی بنا پر کام التوا میں پڑ گیا اور پھر اٹھارہ سال کے بعد انجام پذیر ہوا جس کا مثبت نتیجہ یہ نکلا کہ مذکورہ سیمینار میں پیش ہوئے مضامین کے علاوہ اور بھی کئی مضامین شاملِ اشاعت کیے گئے۔ یہ بھی کوشش کی گئی کہ ان محققوں کا ذکر آئے جنھیں روزگار وغیرہ کے باعث ریاست سے باہر اپنا مستقر بنانا پڑا۔ بقول مرتب مدھیہ پردیش کے بعض علاقوں میں تحقیقی کام کی جانب کافی توجہ دی گئی جس کی کامیابی کا سہرا وہ ڈاکٹر گیان چند جین، ڈاکٹر ابو محمد سحر اور پروفیسر عبدالقوی دسنوی کے سر باندھتے ہیں۔ اس کے باوجود انھیں اس بات کا احساس ہے کہ ابھی یہ کام اس معیار کو نہیں پہنچ سکا ہے جس پر فخر کیا جا سکے۔

زیرِ نظر کتاب تین حصوں میں تقسیم کی گئی ہے۔ پہلے حصے میں مدھیہ پردیش سے متعلق تحقیق نگاروں کے فکر و فن پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ دوسرے حصے میں مدھیہ پردیش کے مختلف علاقوں، دانش کدوں اور درس گاہوں کی تحقیقی سرگرمیوں کو بیان کیا گیا ہے جبکہ تیسرے حصے میں متفرق تحقیقی موضوعات پر بحث کی گئی ہے۔ پہلا باب 'گیان چند جین کا تحقیقی نقطۂ نظر' ڈاکٹر سیدہ جعفر نے رقم کیا ہے جو مشہور کتاب 'تاریخ ادب اردو ۱۷۰۰ء تک' لکھنے کے دوران میں ڈاکٹر گیان چند کی معاون و مددگار رہی تھیں۔ ڈاکٹر سیدہ جعفر گیان چند جین کو اردو کا ایک بلند قامت محقق گردانتی ہیں۔ عتارِ شمیم کے مضمون 'ڈاکٹر ابو محمد سحر: اردو قصیدہ کے معتبر ناقد اور محقق' میں قصیدہ کی شناخت، ہیئتی نظام اور تہذیب و ترتیب کے حوالے سے موصوف کے کام کی سراہنا کی گئی ہے۔ سحر صاحب کی کتاب 'اردو میں قصیدہ نگاری' کو، جو اردو قصیدے کی مختصر تنقید و تاریخ ہے، اس میدان میں اولیت حاصل ہے۔ 'پروفیسر عبدالقوی دسنوی بہ حیثیت محقق' میں ڈاکٹر محمد نعمان خاں نے دسنوی صاحب کی تحقیقی خدمات پر بحث کی ہے۔ موصوف نے ۱۵ تحقیقی کتابیں، ۲۰۰ سے زائد تحقیقی مضامین اور ۱۰ اشاریے تحریر کیے ہیں۔ انھوں نے بھوپال میں اقبال، غالب اور ابوالکلام آزاد کے قیام اور نگارشات پر بھی تحقیقی کام کیا ہے جن سے ان کی تبحرِ علمی اور تجسس و تلاش کی تصدیق ہوتی ہے۔ پروفیسر شفیق اللہ کے مضمون 'پروفیسر حنیف نقوی' میں نقوی صاحب کی تحقیقی کاوشوں میں حق گوئی، محنت اور لگن کی جانب اشارہ کیا گیا ہے۔ موصوف ادب کے کئی گمنام گوشوں کو سامنے لانے میں بھی کامیاب ہو چکے ہیں۔ پانچویں باب میں پروفیسر یعقوب یاور نے 'ڈاکٹر سید حامد حسین کے تنقیدی و تحقیقی نظریات' کے تحت ان کے فکر و فن پر سیر حاصل بحث کی ہے۔ بقول مضمون نگار "وہ دانش ورانہ تحقیق و تنقید کے مردِ میدان تھے۔ ان کو روی اور کیتی طریقۂ نقد و تحقیق نہ صرف ناپسند تھا بلکہ وہ اس کے زبردست مخالف اور شدید نکتہ چیں بھی تھے۔" مضمون 'ابراہیم یوسف بہ حیثیت ناقد و محقق' میں عتارِ شمیم فرماتے ہیں کہ "ابراہیم یوسف ایک ایسے منفرد تخلیق کار، ناقد اور محقق نظر آتے ہیں کہ جن کی تحریریں ادب کی اعلا قدروں کی پہچان اور ان کے وقار اور معیار کا آئینہ ہیں۔" ابراہیم یوسف نے اردو ڈرامے کی تخلیق، تنقید اور تحقیق پر اپنی کوششیں مرکوز کی ہیں۔ ان کی نگارشات کی فہرست طویل ہے البتہ چند کتابیں اہم ہیں جیسے صولت عالم گیری، اندر سبھا اور اندر سبھائیں، اردو کے اہم ڈرامہ نگار، ہندی ڈرامے کا ارتقا اور اردو ڈرامے کا تنقیدی جائزہ۔ ساتواں باب 'مدھیہ پردیش کے نامور محقق اور ناقد پروفیسر شیخ فرید' کے عنوان سے ڈاکٹر محمد اشفاق عارف نے قلم بند کیا ہے۔ بقول عارف ڈاکٹر صاحب کے ایک سو سے زیادہ تنقیدی اور تاریخی مضامین ملک کے مختلف علمی و ادبی رسالوں میں شائع ہو چکے ہیں۔ ان مضامین کے علاوہ ان کی دو کتابیں 'حضرت شاہ عیسیٰ جنداللہ' اور 'شاہ بہاؤ الدین باجن حیات اور گجری کلام' شائع ہو چکی ہیں۔ 'ڈاکٹر عبدالودود' کے عنوان سے ڈاکٹر حنیف وودو اور ڈاکٹر محمد نعمان خاں نے جو مضمون لکھا ہے اس میں موصوف کی حیات، فکر و فن اور لسانیات کے ساتھ دلچسپی پر مختصر روشنی ڈالی گئی ہے۔ مضمون 'بھوپال کے معروف ناقد و محقق' میں ڈاکٹر انیس سلطانہ اور محمد نعمان خاں نے پروفیسر آفاق احمد اور ڈاکٹر اخلاق اثر کی ادبی خدمات کو بیان کیا ہے جبکہ ڈاکٹر وسیم افتخار انصاری کے مضمون 'ڈاکٹر خلیل احمد صدیقی: بحیثیت محقق' میں ان کے کارناموں جیسے 'رنگیٖ کا تنقیدی مطالعہ' وغیرہ پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

حصہ دوم میں مدھیہ پردیش کے مختلف علاقوں میں اردو تحقیق سے متعلق مضامین شامل ہیں جیسے 'بھوپال میں تحقیق و تنقید کا سوا سو سالہ سفر' (پروفیسر انیس سلطانہ)، 'برہان پور میں اردو تحقیق۔ کل آج اور کل' (ڈاکٹر محمد شفیع)، 'اور ریاست جاورہ پر ایک تحقیقی نظر' (پروفیسر نجیبہ منصوری)۔ اس کے علاوہ مختلف جامعات میں اردو تحقیق کا پیرا مثلاً 'وکرم یونیورسٹی میں اردو کی تحقیقی سرگرمیاں' (ڈاکٹر واجد قریشی)، 'جبل پور یونیورسٹی میں اردو ادب سے متعلق تحقیقی سرگرمیاں' (ڈاکٹر عبدالباقی)، 'اندور میں اردو تحقیق کی سمت و رفتار' (ڈاکٹر عزیز اندوری)، 'ساگر یونیورسٹی میں اردو تحقیق' (ڈاکٹر وسیم انور)، اور 'مدھیہ پردیش کے دانش کدوں اور درس گاہوں میں اردو تحقیق' (عتارِ شمیم) پیش کیا گیا ہے۔

کتاب کے تیسرے حصے میں کچھ متفرق موضوعات پر مضامین شامل کیے گئے ہیں جیسے 'پروفیسر مظفر حنفی کے تیار کردہ حوالہ جاتی دستاویز' (ڈاکٹر ممتاز الحق)، 'خالد محمود اور ان کے سفر ناموں کا مطالعہ' (ڈاکٹر سید حامد حسین)، 'ظہیر دہلوی۔ حیات و فن' (ڈاکٹر خلیل احمد شبیر صدیقی)، 'اندور کے تحقیقی مقالے' (ڈاکٹر حدیث انصاری)، اور 'سروج کی ادبی خدمات۔ ایک جائزہ' (عتارِ شمیم)۔

کتاب کو بہ نظر غائر دیکھا جائے تو یہ عیاں ہوتا ہے کہ مرتب نے دریا کو کوزے میں بند کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ انھوں نے نہ صرف مدھیہ پردیش کے معروف محققوں کے فکر و فن کو اختصار کے ساتھ پیش کیا ہے بلکہ اردو تحقیق سے وابستہ مختلف علاقوں، جامعات اور درس گاہوں میں جو بھی کام ہوا ہے اس کے بارے میں تفصیلات یکجا کر کے انھیں پیش کرنے کی کوشش بھی کی ہے۔ زیرِ نظر کتاب عام قارئین کی دلچسپی کے ساتھ ساتھ حوالہ جاتی اہمیت بھی رکھتی ہے۔ ⊙⊙

بقیہ: تو ابھی راہ گزر میں ہے...

صفحہ ۳ سے آگے

زبان میں حسبِ ضرورت، بنیادی سطح پر لکھنا اور پڑھنا جانا ہو۔ اس اصول کی روشنی میں تعلیم یافتہ یعنی حقیقتاً پڑھے لکھے مسلمان کتنے ہوں گے اس کا قیاس بآسانی کیا جا سکتا ہے) یعنی مجموعی طور پر صورتِ حال قابلِ اطمینان نہیں، امتِ مسلمہ کی تعلیمی حالت آج بھی زبوں حال ہے۔ یہ ایک تلخ ترین حقیقت ہے جس کا ادراک اور عرفان لازم ہے۔ بقول اقبال:
تو ابھی رہ گزر میں ہے قیدِ مقام سے گزر

در اصل 'سو سیڈ کا سٹن' ناکام تو ہرگز نہیں، البتہ نامکمل ضرور ہے کیوں کہ فی الوقت ملک بھر میں مسلمانوں کی تعداد کو اگر پچیس کروڑ تسلیم کر لیا جائے تو ان میں سے کم از کم پانچ لاکھ مسلمان نوجوان تو مختلف اعلا تعلیمی درس گاہوں و دانش گاہوں میں زیرِ تعلیم ہوں گے ہی۔ ان میں سے محض تین ہزار بیس ہزار ہی علی گڑھ میں ہوں گے، یوں ہی مسلم یونیورسٹی میں برادرانِ وطن کے تو

طالبوں کی لائق ذکر تعداد ہر دور میں حصول تعلیم میں حصہ دار رہی ہے۔ اس صورت حال میں سرسید کی قائم کردہ واحد مسلم یونیورسٹی ملت کی تعلیمی ضروریات کی تکمیل نہیں کر سکتی۔ اس مقصد کے حصول کے لیے تو جامعہ ملیہ اسلامیہ، جامعہ ہمدرد اور نو قائم شدہ چند دیگر اقلیتی ادارے مل جل کر بھی ناکافی ہیں، لہٰذا متعدد دانش گاہوں، درسگاہوں نیز جدید مدرسوں کے قیام و اجرائے مسلسل کی ضرورت ابھی باقی ہے۔ اب اختتام گفتگو کے طور پر یہاں چند سوالات قائم ہوتے ہیں، مثلاً سرسید کی تحریک کس حد تک کامیابی سے ہم کنار ہوئی، اس کی وسعت و ہمہ گیری کن حدود تک روا ہو سکی، نیز اس تحریک کے احیا اور ایک سفر نو کی کیا تدبیر ہے۔ ان سوالات کے جوابات بھی ملت مسلمہ کو خود ہی تلاش کرنے ہیں۔ گو جواب ایک ہی ہے جو از خود مترشح ہے، اور وہ یہ کہ سرسید کی تحریک یعنی علی گڑھ تحریک کو از سر نو زندہ کیا جائے، مزید تابندہ کیا جائے، وسیع سے وسیع تر کیا جائے اور حقیقتاً فعال بنایا جائے۔ سید اعظم نے جو شمع علم روشن کی تھی اسے مشعل بنا کر، اس کی تابنا کی کو شہر شہر، قصبہ قصبہ، قریہ قریہ، محلہ محلہ اور گھر گھر پہنچایا جائے اور یہ ذمہ داری سرسید کے قائم کردہ ادارۂ تعلیم کے سپوتوں یعنی مسلم یونیورسٹی کے اساتذہ، طلبہ اور اس قبیلے کی ہے، جسے ہم علی گڑھ برادری کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ فرزندان علی گڑھ پہل کریں، کچھ پیش رفت کریں، تو یہ امر یقینی ہے کہ وہ تنہا نہیں ہوں گے، لوگ ساتھ آتے جائیں گے اور کارواں بنتا جائے گا اور جب کارواں کی تشکیل و ترتیب ہو جائے گی تو نظم بھی قائم ہو جائے گا اور کوئی نہ کوئی میر کارواں بھی نصیب ہو ہی جائے گا۔ ضرورت قدم بڑھانے کی ہے، کیوں کہ صد ہا منزلوں کا سفر بھی اقدام اول سے شروع ہوتا ہے۔ برادران علی گڑھ آج ایک نیا عہد نامہ مرتب کریں اور اس پر عمل پیرا بھی ہوں۔ سید عالی مقام زندہ باد، گلشن سید پائندہ باد۔ ●●●

بقیہ: اردو میں پسِ مرگ شاعری

صفحہ ۸ سے آگے

شریف پڑھی جا رہی ہے اتنے میں محبوب آ جاتا ہے کس حسرت سے کہتے ہیں:

ہم عیادت آئے وہ لیکن قضا کے ساتھ
دم ہی نکل گیا مرا آوازِ پا کے ساتھ
(مومن)

جو انھیں وفا کی سوجھی تو نہ زیست نے وفا کی
ابھی آ کے وہ نہ بیٹھے کہ ہم اٹھ گئے جہاں سے
(سالک)

غسل اور تکفین کی تیاری ہے۔ یہاں مسلمان شاعر کی غسل سے بے رغبتی یہ زبان شعر بولتی ہے:

میت کو غسل دیجو اس خاکسار کی
ہے تن پہ خاک کوچہ دلبر لگی ہوئی
(ذوق)

پھر وہ خاک ہی کرنا تھا مجھ کو
تو پھر کاہے کو نہلایا گیا ہوں

خیر مردہ بدست زندہ کے مصداق بچارے کو نہلا دیا لیکن قبر میں اتارے جاتے ہوئے بھی یہ شکوہ سنائی دیتا ہے کہ

کسی کے منہ سے نہ نکلا یہ مرے دفن کے بعد
کہ ان پہ خاک نہ ڈالو کہ ہیں نہائے ہوئے

اب اندر کا حال (Under ground) شاعر کی زبانی سنئے:

ہم نے پنہ کے قبر میں اندھیر کر دیا
وہ گھر زمیں میں ہاں تو بہت آسماں سے

بظاہر ہے کسی گور غریباں پر برستی ہے
وہ لے زیر زمیں جا کر جو دیکھا خوب بستی ہے

دو محبتوں کی ہماری قبر میں حاجت نہیں
خانۂ محبوب کا کوئی کوا چاہیے
(ناسخ)

تا کہ تاک جھانک ہو سکے۔

عقیدہ ہے کہ قبر کے پٹتے ہی منکر نکیر دنیا میں کیے کاموں کا کچا چٹھا لے کر حاضر ہو جاتے ہیں اور حساب کتاب شروع ہو جاتا ہے جب کہ مومن بچارے کی کمزوری ہی حساب ہے شاید اسی لیے اللہ میاں نے اسے بے حساب دینے کا وعدہ فرمایا ہے۔ بہرحال ہمارے شعرا حضرات کی فکر سخن نے اس میدان میں بھی ان کا ساتھ نہ چھوڑا۔ کہتے ہیں:

قاصد کہہ کے یار کا منکر نکیر کو
خوب ہی لپٹ کے میں رویا مزار میں

اشتیاق اور صدق عاشقی ملاحظہ ہو۔ اسی کا اظہار کرتے ہوئے ایک شاعر تو انھیں چور گردان کر چونک کر چیخ اٹھتے ہیں:

منکر نکیر جس گھڑی میں نے جو دیکھا
دوڑو پولیس چور گھسے ہیں مزار میں

محبوب کی یاد میں فلاں ایک اور سخن ور کی بھی چوکھلاہٹ دیکھیں:

سنا رہا ہوں نکیرین کو فسانہ ہجر
سوال ان کے جدا ہیں جواب میرے جدا
(علی اوسط رشک)

نکیرین سے نپٹنے کا ایک شاطرانہ طریقہ غالب نے بھی سوچا تھا:

ظاہر ہے کہ گھبرا کے نہ بھاگیں گے نکیرین
ہاں منہ سے مگر بادۂ دوشینہ کی بو آئے
(غالب)

کہتے ہیں کہ مرنے کے بعد بھی جذبات، محسوسات (نفرت، حسرت، رشک، محبت) ان کا پیچھا نہیں چھوڑتے چناں چہ بعد از مرگ شاعری میں بھی ان کا بھرپور اظہار ہوتا ہے:

کیا قتل اس نے غیر کو مرے ہم رشک کے مارے
اجل بھی دوستو آئی نصیب دشمناں ہو کر

ہیں جی ستم پیشہ محبوب نے مرنے کے بعد عاشق کے ساتھ کیے گئے ظلم و ستم کے ازالے کے طور پر سائے کے لیے حضرت کی تربت پر نیم کا درخت لگوا دیا لیکن اس پر بھی بے چین اور بدگمان روح کو چین کہاں۔ دیکھیے کیا بات پیدا کی ہے ظالم نے:

قبر پر میری لگایا نیم کا اس نے درخت
بعد مرنے کے مری توقیر آدھی رہ گئی

محبوب نے آپ کے مزار پر چراغ اس لیے جلوایا تاکہ پس مرگ بھی قبر میں جلتا رہوں۔ رقیب کی قبر پر (جسے شاید ان کی آہ لے ڈوبی ہو) چراغ جلتا دیکھتے ہیں تو گالیوں پر اتر آتے ہیں:

اس حرامی کی قبر پر رات بھر جلتا رہے
بر مزار ما غریباں نے چراغے نے گلے

قصہ مختصر جب تنگ جیسے رو رہا ہے۔ میر کے لفظوں میں:

نامرادانہ زیست کرتا تھا

دیکھا ہمارے شعرا کے تخیل کی پرواز۔ یہ چاہیں تو جنت میں مشاعرہ کرا دیں، غالب کی روح کو دنیا میں بلا کر ترقی پسند شعرا سے بھڑوا کر غریب کی ہجو کرا دیں، لیکن بجائے اس کے کہ عقدہ ہائے عقبیٰ سے کچھ پردے اٹھا کر دنیا والوں کی معلومات میں کچھ اضافہ فرماتے، وہی ہجر و فراق، جور و جفا کے قصے، محبوب کی بے اعتنائی، گلے شکوے یعنی وہی رونا دھونا جو عمر بھر کرتے آئے تھے۔

آگے بڑھیے تو قصہ دراز ہے انتہا سے ہم عبدالحمید عدم نے غلط نہیں کہا ہے کہ:

دنیا میں جانے قدم ان کا کیوں نہیں لگتا
کہ عرش پار کے اکثر سراغ لاتے ہیں

ظاہر ہے عرش پار کے سراغ دو چار دن سے تو لائے نہیں رہے یہ سلسلہ تو میر، ناسخ اور غالب و مومن کے زمانوں سے جاری ہے۔ یہ تو ہو نہیں سکتا کہ عالم الغیب جو خبیر بھی ہے اور بصیر بھی، اس سے لاعلم رہا ہو، اس لیے ہمیں یقین ہے کہ افلاطون کی طرح اللہ میاں نے بھی ہمارے شعرائے کرام کو غیر مکلف قرار دے دیا ہے:

بڑی مشکل سے میاں بے خبری آوے ہے

●●●

بقیہ صفحہ ۵ سے آگے

کسی اسکول میں لسانی اقلیت سے تعلق رکھنے والے بچوں کی تعداد دس ہو تو انہیں اپنی زبان میں تعلیم حاصل کرنے کا حق حاصل ہے۔ لسانی اقلیتوں کے قومی کمیشن نے اپنی رپورٹ میں اقلیتی اسکولوں میں طلبہ اور ٹیچر کے تناسب میں زبردست فرق پر بھی تشویش کا اظہار کیا ہے اور مناسب تعداد میں ٹیچروں کی تقرری کی سفارش کی ہے۔ رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ بالعموم طلبہ اور ٹیچروں میں 1.40 کا تناسب ہوتا ہے، لیکن اقلیتی اسکولوں میں یہ فرق اس سے بہت زیادہ ہے۔ کمیشن نے اسی طرح لسانی اقلیتوں کے ٹیچروں کی تربیت، اقلیتی زبانوں میں نصابی کتابوں اور اسٹڈی میٹریل کی سپلائی کی بھی سفارش کی ہے۔ خیال رہے کہ آئین کی دفعہ 30 کے تحت ملک میں اقلیتوں کو اپنی پسند کے تعلیمی ادارے قائم کرنے اور انھیں چلانے کا حق حاصل ہے۔ کمیشن کا کہنا ہے کہ جس طرح کے اختیارات قومی کمیشن برائے اقلیتی تعلیمی ادارہ جات کو حاصل ہیں اسی طرح کے اختیارات قومی لسانی اقلیتی کمیشن کو بھی تفویض کیے جائیں۔

(آئی این ایس)

طنز و مزاح

اردو میں پسِ مرگ شاعری

منظور عثمانی (۱۷-غفور نگر، اوکھلا، نئی دہلی-110025)

کسی بھی شعبۂ حیات کو لے لیں ہر میدان میں روایات کی حکمرانی ہے۔ کیا معاشرت، کیا سیاست اور کیا ادب، غرض ہر ترقی رواج ہمارے رویوں کو طے کرتے ہیں۔ Values (اقدار) وہ بندھن ہیں جو ہمیں سماج سے وابستہ یا باندھے رکھتے ہیں۔ روایت پسند لوگوں کی نظر میں:

جو روایات بھول جاتے ہیں
اپنی ہر بات بھول جاتے ہیں

لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ رسم و رواج اچھے بھی ہیں اور برے بھی۔ بے موقع چھینکوں، ایک چشموں، بلیوں اور "کہاں جا رہے ہو" کہہ کر ٹوکنے والوں نے نہ جانے کتنوں کے راستے کھوٹے کیے ہیں۔ جب ہم لڑکے ہوا کرتے تھے تو اپنے ایسے ہی ضعیف الاعتقاد پڑوسی کا گھر سے نکلنا بند کرا دیا تھا۔ کبھی کسی واحد تورخاں سے ان کی مڈبھیڑ کرا دی تو کبھی بلی سے راستہ کٹوا دیا، کبھی فرسٹ ایڈ میسر نہیں ہوئی تو خود چھینک کر بڑی معصومیت و ادب سے پوچھ لیا "چچا میاں کہاں تشریف لے جا رہے ہیں؟" بس پھر کیا تھا چچا لاحول پڑھتے ہوئے فوراً سے اندر (Back to Pavilion) ادھر چچی ڈیوڑھی میں کھڑی صلواتیں سنا رہی ہیں۔ روایات سے مزاج بنتے ہیں۔ صالح اقدار پر چل کر قومیں سرخرو ہوتی ہیں اور غیر صحت مند رواج انھیں پس ماندگی کے گہرے گڑھوں سے باہر نکلنے نہیں دیتے۔ قارئین ہمیں معاف فرمائیں، آپ بھی سوچ رہے ہوں گے کہ یہ شخص کہنا کیا چاہتا ہے۔ کیا بتائیں ہم خود اپنی اس عادت سے پریشان ہیں۔ خیر تو اپنی ہی بات کو کاٹتے ہوئے بتا دیں کہ ہمیں اردو شاعری کی کچھ مضحکہ خیز روایتوں کے بارے میں عرض کرنا یا ان کے حسن و جمال کی تعریف کرنا ہے۔ چناں چہ ہمارے شعرائے قدیم نے سوائے یہ کرنے کے اور کچھ کیا ہی نہیں۔ سو سال سے زیادہ تک ان کی آنکھ، ناک، زلف، رخسار غرض ان کے انگ انگ یہاں تک کہ انگیا کی ہی تعریف میں لگے رہے اور مزے کی بات یہ کہ اس میں خواجہ میر درد اور مظہر جان جاناں جیسے صاحب طریقت بزرگ اور غالب جیسے رند بلانوش بلا تفریق سب شامل تھے۔ چناں چہ ان کے کلام کو سامنے رکھ کر محبوب کا سراپا کھینچا جائے تو محسوس ہوگا کہ سارے کے سارے ایک ہی مشترک محبوبہ سے عشق کرتے رہے۔ یہ ہمارا ہی نہیں مولانا حالی کا بھی ایسا ہی وچار ہے۔ مولانا محمد حسین آزاد مصنف 'آب حیات' بھی ایسی ہی رائے رکھتے ہیں۔ اب ایسی بھی کیا روایت پسندی کہ سیکڑوں برس کی بڑھیا سے باجماعت عشق لڑانے چلے جا رہے ہیں:

توبہ ٹوٹی بھی تو ٹوٹے ہوئے پیمانوں سے

ایسی ہی ایک اور روایت ہمارے شعرا کی معشوق کی کمر کی کھوج میں سرگردانی ہے۔ جس شاعر کو دیکھو محبوب کی کمر کے پیچھے پڑا ہے۔ کوئی بھی تو ایسا نہیں ملے گا جس نے کمر کو ان چھوا چھوڑا ہو۔ یہاں بھی وہی روایت پسندی یعنی کمر صرف وہ جو معدوم ہونے کی حد تک باریک ہو اور جسے ننگی آنکھ سے دیکھا نہ جا سکے۔ اکبر الہ آبادی کے محبوب کی کمر جب خوردبین کی مدد سے دریافت کر لی گئی تو نہایت قلق کے ساتھ فرماتے ہیں:

سر پیٹے خوردبین سے کمر ان کی دیکھ لی
مشرق کی شاعری کا مزہ کرکرا ہوا

اور تو اور مولانا شبلی جیسے ثقہ بزرگ نے بحر و بر کے پانی اور خاک چھان ڈالے۔ کس جتن کے ساتھ گریہ کناں ہیں مولانائے محترم:

کی سیر گرچہ بحر و بر کی
لیکن نہ ملی خبر کمر کی

کیا عجب مذاق ہے کہ شعرائے کرام نے غریب کمر کو باریک سے باریک تر بناتے بناتے عدم آباد کی سیر کرا دی جس کے نتیجے کے طور پر خود کمر ہی مذاق کا موضوع بن گئی۔ بقول میر لکھنوی:

یہ حسن نرالا ہے کہ وہ عضو نمارد
معشوق وہ ہے جس کے کمر بھی ہو دہن بھی

کرسی پہ بیٹھے جس کمر کی ہے بتایئے
نزاکت سے نہیں کیا چیز آخر تھام بیٹھے ہیں

ایک اور شاعر ہاشم عظیم آبادی نے کمر کو شعر میں یوں باندھا:

ہے کمر ہی جو سرے سے غائب
آپ کیا نام خدا باندھتے ہیں؟

معاف کیجیے بات کچھ طویل ہوگئی، ٹھیک تھا کبھی تو بہ الفت آگئیں کیوں کر آپ تو جانتے ہی ہیں کہ پیٹھ پیچھے کی بات ہم سب کا مرغوب ترین مشغلہ ہے۔ ذکر تھا اردو شاعری میں روایت پسندی کا، تو جناب کمر ہی کی طرح ایک اور دل چسپ روایت قاصد یا نامہ بر ہے۔ یہاں بھی وہی بھیڑ چال کی سی کیفیت نظر آتی ہے۔ پرانے شاعروں میں ایک بھی ایسا نہیں مل پائے گا جس نے اپنے دل پر عشق کے جملہ مراحل طے کیے ہوں۔ جسے دیکھو قاصد کی انگلی پکڑے نظر آتا ہے۔ یہ بھی عجیب ہے کہ اردو شاعری میں محبوب کلی طور پر جفا پیشہ، ستم آزما اور خونخوار ہوتا ہے۔ صاحب جیسی چاہے قسم لے لیں جو ہم نے قاصد کو کامیاب لوٹتے دیکھا ہو، ہاں ایسی مثالیں ضرور مل جائیں گی جہاں بچارہ نامہ بر شدید زخم خوردگی کی حالت میں لوٹا ہو:

کیا جواب! حضرت دل دیکھنا ذرا!
پیغامبر کے ہاتھ میں ٹکڑے زباں کے ہیں

غالب کے قاصد کی گردن تو بسم اللہ اللہ اکبر ہی ہوتے ہوتے رہ گئی وہ تو اتفاقاً غالب آس پاس ہی تھے کہ الزام اپنے سر اوڑھ کر اس غریب کی جان بخشی کرالی:

قاصد کی اپنے ہاتھ سے گردن نہ ماریے
اس کی خطا نہیں ہے یہ میرا قصور ہے

لیکن اس کے باوجود غالب کے بے مطلب خط کی طرح قاصد روانہ ضرور کیا جاتا ہے چاہے وہ دغا بازی ہی کیوں نہ کر بھاگے:

ٹھہرے تو کچھ کلام نہیں لیکن اے ندیم
میرا سلام کہیو اگر نامہ بر ملے

ارے صاحب کمال تو یہ ہے کہ حکیم الامت جناب علامہ اقبال بھی حسب معمول اپنے قاصد کے ناکام لوٹ آنے پر اس سے کرید کرید کر پوچھ رہے ہیں:

تامل تو تھا ان کو آنے میں لیکن
مگر یہ بتا طرزِ انکار کیا تھی

پس مرگ شاعری کی روایت:

ذکر جب روایتوں کا چھڑ گیا تو اور سنیے۔ اردو کی شاعرانہ روایتوں میں سب سے دل چسپ روایت ہماری نظر میں پس مرگ شاعری ہے۔ جب جانتے ہیں کہ ملک عدم اور عالم آب و گل کے بیچ اللہ میاں نے ایسا آہنی کرٹین (Iron curtain) [آہنی پردہ] تان رکھا ہے کہ عالم بالا سے کوئی خبر (Smuggle) کرنا محال ہی نہیں بلکہ ناممکن ہے کیوں کہ:

احوال کس سے پوچھیے یاران رفتہ کا
کسی کا گور سے آگے پتا نہیں ملتا

پر تجربہ دیکھیے شعرا حضرات مر کر بھی شعر گوئی سے باز نہیں آتے:

خاک میں مل جائے یا رب بے کسی کی آبرو
غیر میری نعش کے ہمراہ روتا جائے ہے

یا

عمر بھر چلتے کئی کاندھے پہ آئے گور تک
دو گھڑی کے واسطے اوروں کا احساں ہو گیا

یا

بعد مردن بھی ہوا ہر دو عزیز
وہ قدم سب اپنے بیگانے گئے

میت کے راستے میں مرحوم کے محبوب کی گلی بھی پڑتی ہے یہاں بھی شعر حاضر:

ہے انتظار دید میں لاشہ اچھل رہا
حالاں کہ کوئے یار ابھی اتنی دور ہے

میت قبر میں اتاری گئی لیکن:

آغوش گور ہوگئی آخر لہو لہان
آساں نہیں ہے آپ کے کشتہ کو تھامنا

عزادار سپرد خاک کر کے حسب دستور لوٹنے لگتے ہیں تو شکوہ ملاحظہ فرمائیں:

قبر میں رکھ کر نہ ٹھہرا کوئی دوست
میں نئے گھر میں اکیلا رہ گیا

لحد میں بھی انتظار یار کی شدت کم نہیں ہوتی:

محال خواب لحد ہے کہ ہر چہ بیداری
میں چونک اٹھوں گر اس کے قدم کی آہٹ ہو
(ذوق)

یا

میں تڑپ کر سنگ تربت بعد اضطراب اٹھا
مری قبر پر وہ آ کر جو گیا شتاب اٹھا
(جرأت)

نزع کی کیفیت طاری ہے، سرہانے بیٹھیں (بقیہ صفحہ ۷ پر)

مدیر: اطہر فاروقی
Editor: Ather Farouqui
شریک مدیر: محمد عارف خاں
Joint Editor: Mohd. Arif Khan
پرنٹر پبلشر: شاہد خاں
Printer, Publisher: Shahid Khan
مطبوعہ: ثمر آفسیٹ پرنٹنگ پریس، دہلی
Printed at: Samar Offset Printing Press, Delhi
مالک: انجمن ترقی اردو (ہند)، اردو گھر ۲۱۲- راؤز ایونیو، نئی دہلی-۱۱۰۰۰۲
Proprietor: Anjuman Taraqqi Urdu (Hind)
Urdu Ghar, 212-Rouse Avenue, New Delhi-110002
قیمت (فی شمارہ) دو روپے، سالانہ: ۸۵ روپے (بیرونی ممالک: آٹھ امریکن ڈالر)
Subscription: (Per Issue): Rs. 2/-, Yearly: 85/-
(Foreign Countries: US $ 8)
http://www.atuh.org Phones: 23237212, 23237214